جرم، جنگ اور جذبات

انسانی فطرت کو بے نقاب کرنے والی نو سچی کہانیاں



JBD Press
JAHANGIR BOOK DEPOT
URDU BAZAAR LAHORE

عنایتُ اللہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

پاکستان ورچوئل لائبریری پر موجود تمام کتابیں قارئین کے مطالعے اور دعوتی و اصلاحی مقاصد کے لئے اپلوڈ کی جاتی ہیں۔

تنبیہ

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی سخت ممانعت ہے، اور ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔



فہرست

پیش لفظ

نو سچی کہانیوں کا ایک اور مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے۔

ہر کہانی انسان کی فطرت کا کوئی نہ کوئی ایسا پہلو سامنے لاتی ہے جو حیران کُن اور عجیب سا لگتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کے مظاہرے ہر انسان نہیں کر سکتا کیونکہ ہر انسان کی فطرت ایسی نہیں ہوتی۔ علم نفسیات کچھ اور کہتا ہے۔ انسان نیک اور پاک پیدا ہوتا ہے۔ اُس کی فطرت میں بدی کی آمیزش اس دنیا میں آکر ہوتی ہے۔ یہ اُن اثرات کا نتیجہ ہے جو گھر، معاشرہ اور اچھے بُرے حالات انسان پر مرتّب کرتے ہیں۔ لہٰذہ ہر انسان کی فطرت میں مجرمانہ رجحانات موجود ہوتے ہیں بعض لوگ اِن منفی اور تخریبی رجحانات پر غالب آجاتے اور بعض پر یہ رجحانات غالب آجاتے ہیں۔ اِسی سے نیک و بد کی تمیز ہوتی ہے۔

اِن نو کہانیوں میں آپ مجرمانہ رجحانات کے مظاہرے دیکھیں گے اور یہ بھی دیکھیں گے کہ بظاہر مجُرم قسم کے کردار کس طرح اچانک بہت بڑی نیکی کر گزرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی فطرت کو خدا نے نیک بنایا ہے۔

ہمارے ہاں پیر پرستی کی جڑیں زمین کے اندر دُور تک چلی گئی ہیں۔ پیروں کا ایک رُوپ تو وہ ہے جو اُن کے مریدوں کو نظر آتا ہے اور مرید مشکل کے وقت اللہ اور رسولؐ کی بجائے اپنے اپنے پیر کو پکارتے اور اُن کے آستانوں پر جا ماتھے رگڑتے ہیں۔ ان کہانیوں میں آپ پیروں کا وہ رُوپ

دیکھیں گے جو مریدوں کو نہیں، صرف جرائم پیشہ لوگوں اور تھانیداروں کو نظر آتا ہے۔ یہ رُوپ اُس غیرت مند عورت کو بھی نظر آجاتا ہے جسے اُس کا پیر اپنے خاص کمرے میں لے جاتا یا اُسے رات کو اپنے ہاں بلاتا ہے۔ اگر عورت غیرت مند نہ ہو تو وہ اپنے پیر کی ہوس کاری کو بھی تصوّف اور برگزیدگی کا ایک عمل سمجھ لیتی ہے۔

یہ سعادت مکتبۂ داستان کو نصیب ہوئی ہے کہ ہم نے ماہنامہ "حکایت" اور مکتبہ کی کتابوں کی وساطت سے پیر پرستی کے بہروپ کو بے نقاب کیا اور انسان کو اُن قوّتوں سے روشناس کیا ہے جو اُسے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہیں اور جن سے وہ پیروں کے آستانوں کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتا ہے۔

ان کہانیوں میں آپ کو اور بھی کئی رنگ ملیں گے۔ ان میں تفریحی عنصر تو نمایاں ہے لیکن ان میں کچھ عناصر ایسے بھی ہیں جو آپ کے ذہن میں بڑی لمبی مدّت تک گونجتے رہیں گے۔ ہر کہانی آپ کو سوچوں میں غرق کر دے گی۔

عنایت اللہ
مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

انصاف جو خُدا نے کیا

پیر و مُرشد کے قتل کا یہ کیس کوئی عجیب و غریب کہانی تو نہیں لیکن جس طریقے سے یہ کہانی بیان کی گئی ہے وہ بہت دلچسپ ہے۔ اب تک آپ تھانیداروں کی سُنائی ہوئی تفتیشی کہانیاں پڑھتے رہے ہیں۔ اس کیس میں متعلقہ تھانیدار کی تفتیش بالکل مختصر رہی ہے۔ اصل تفتیش سیشن کورٹ میں جا کر ہوئی۔ یہ ایک وکیل کی جرح، بحث اور دلائل تھے جنہوں نے استغاثہ کے پاؤں تلے سے زمین نکال لی۔

یہ کیس میرے سامنے اس طرح آیا کہ میں نے ایل۔ ایل۔ بی میں داخلہ لیا تو ایک پُرانے سٹوڈنٹ عبدالقدیر کے ساتھ دوستی ہو گئی۔ وہ ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان دینے والا تھا۔ ایک دوسرے کے گھروں میں بھی آنا جانا ہو گیا۔ عبدالقدیر کے والد صاحب مشرقی پنجاب کے ایک شہر میں اونچے درجے کے وکیل تھے۔ (عبدالقدیر اس شہر کا نام ظاہر کرنے میں محتاط ہے)۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان آ گئے اور کراچی میں پریکٹس شروع کر دی۔ تین ساڑھے تین سال بعد بڑھاپے اور بیماری نے پریکٹس چھڑا دی۔ عبدالقدیر کے بڑے بھائی اس پیشے میں والد کی جگہ اور انہی جیسی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ اب عبدالقدیر بھی ضلع کچہری میں پہنچ چکا ہے۔ اس پیشے کے اِسرار و رُموز سمجھنے میں مجھے عبدالقدیر کی دوستی سے بہت فیض حاصل ہُوا ہے۔

جن حضرات کو عدالتوں سے پالا پڑا ہے، وہ جانتے ہوں گے

کہ وکیل اپنے زیرِ سماعت مقدمے کی تمام گواہیوں اور دیگر کارروائی کی نقلیں حاصل کرتے رہتے ہیں۔ ان سے وہ اپنے دلائل اور بحث وغیرہ تیار کرتے ہیں۔ آخر میں وکیل کے پاس کیس کی مکمل فائل تیار ہو جاتی ہے۔ عبدالقدیر کے والد صاحب نے اپنے بعض نہایت اہم کیسوں کی فائلیں محفوظ رکھی ہوئی ہیں۔ یہ ان کے دونوں بیٹوں کے کام آرہی ہیں۔ یہ کیس انہی فائلوں میں سے لیا گیا ہے اور عبدالقدیر کے والد صاحب نے اس کیس میں جو کردار ادا کیا ہے، وہ اُس نے بتایا ہے۔

واردات یوں ہوئی کہ تشکیلِ پاکستان سے پہلے مشرقی پنجاب کے ایک گاؤں میں ایک مشہور گدّی کا پیر جس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی قتل ہو گیا۔ اُس کے باپ کو مرے تین سال ہو گئے تھے۔ مقتول اپنے باپ کی گدّی پر بیٹھا تھا۔ مقتول کے دادا کے متعلق مشہور تھا کہ مُردوں کو زندہ کر دیا کرتا تھا اور باپ نے ان کرامات میں شہرت حاصل کی کہ سیلاب کو روک دیتا اور بے اولاد کو اولاد دیتا تھا۔ یہ نیا پیر جو قتل ہو گیا تھا، اولاد دینے اور ہر مُراد پوری کرنے اور چوری ڈاکے قتل وغیرہ میں کوئی پکڑا جائے تو بری کرانے میں شہرت رکھتا تھا۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ ملزم اس کا تعویذ باندھ کر عدالت میں جائے تو جج کا دماغ اُلٹا چلنے لگتا ہے "سزا پھانسی کی دینی ہو تو لکھ دیتا ہے بری" ——عبدالقدیر کے والد صاحب بتاتے ہیں کہ یہ گدّی اور اس کا نیا پیر جو قتل ہو گیا تھا عورتوں میں زیادہ مقبول تھا۔

ایک صبح اُس کی لاش گاؤں کے قریب ایک کھڈ میں پائی گئی۔ استغاثہ کے کہنے کے مطابق اُس کے گلے میں رسّی ڈال کر مارا گیا تھا۔ رسّی لاش کے ساتھ پڑی ملی تھی۔ پولیس نے شک کی بنا پر گاؤں کے ایک مزارع کو پکڑا اور پولیس کے بیان کے مطابق اس مزارع نے اقبالِ جُرم کر لیا۔ اُس کا اقبالی بیان ایک ہندو مجسٹریٹ سے زیرِ دفعہ ۱۶۴ قلمبند کرایا گیا۔ ملزم کو جوڈیشل حوالات (جیل) میں بھیج دیا گیا۔

وہ علاقہ آبادی کے لحاظ سے سکّھوں کی اکثریت کا تھا۔ تجارت، عدالتوں اور پولیس پر ہندوؤں کا اثر و رسوخ تھا اور مسلمان اقلیّت میں ہونے کی وجہ سے کمزور پوزیشن میں تھے۔ اتفاق سے جس گاؤں کا یہ کیس تھا وہاں اسّی فی صد آبادی مسلمانوں کی تھی۔ اس کے قریب دو تین گاؤں بھی مسلمانوں کی اکثریت کے تھے۔ یہاں مسلمان جاگیر دار اور زمیندار بھی تھے۔ یہ انگریزوں کی دی ہوئی جاگیریں اور زمینیں تھیں۔ متعلقہ گاؤں کا نمبردار مسلمان تھا۔

جنگِ عظیم دوم ختم ہو گئی تھی اور ملک میں سیاسی بیداری پیدا ہو گئی تھی۔ ہندو تو سیاسی طور پر پہلے ہی بیدار ہو چکے تھے کیونکہ انہیں مہاتما گاندھی جیسے مکّار اور پنڈت جواہر لال نہرو جیسے قابل لیڈر مل گئے تھے۔ مسلمان سیاست میں پیچھے رہ گئے تھے۔ جنگِ عظیم کے آخر میں قائدِ اعظم کی لیڈرشپ میں مسلم لیگ میدان میں اُتری تو مسلمانوں نے بھی سیاست میں سر اٹھایا۔ وقوعہ کے گاؤں کا تھانہ قریبی قصبے میں تھا۔ وہاں مسلم لیگ کی باقاعدہ تشکیل ہو چکی تھی۔ اس کے مقامی صدر ایک صاحب عبداللہ غازی تھے۔ بہت جوشیلے اور مومن۔

کسی ذریعے سے عبداللہ غازی کو پتہ چلا کہ پیر کے قتل میں جس غریب مزارع کو گرفتار کیا گیا ہے، اُس نے اقبالِ جُرم کر لیا ہے اور اقبالِ جُرم صرف تشدّد اور ایذا رسانی سے نہیں کرایا گیا بلکہ مزارع کی نوجوان بیٹی کو تھانے بُلا کر اپنے ملزم یا مشتبہ باپ کے سامنے ننگا کھڑا کر دیا گیا اور کمرے میں دو کانسٹیبلوں کو بھی ننگا کھڑا کیا گیا۔ پھر مزارع سے کہا گیا کہ وہ اقبالِ جرم کر لے ورنہ وہ دیکھ رہا ہے کہ اُس کے سامنے اُس کی بیٹی کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔ مزارع نے اقبالِ جُرم کر لیا اور یہی بیان جو تھانیدار نے خود لکھا تھا، ایک ہندو مجسٹریٹ سے قلمبند کروا کے اُس پر مزارع کا انگوٹھا لگوا لیا گیا۔

مسلم لیگ کے مقامی صدر عبداللہ غازی نے چند ایک سرکردہ

مسلمانوں کو ساتھ لیا اور مزارع کے گاؤں میں گیا۔ مزارع کی بیٹی، بیوی اور کچھ اور لوگوں سے ملا۔ جب یہ سب گاؤں سے واپس آئے تو ان کے ساتھ

اتنے آدمی تھے کہ جلوس کی صورت بن گئی۔ دوسرے دن عبداللہ غازی ایک وفد لے کر پولیس کے ضلع ہیڈ کوارٹر میں گیا اور ڈی۔ ایس۔ پی سے ملاقات کی۔ وہ انگریز تھا۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے مسلمانوں کو ٹھنڈا کیا اور تحقیقات کا وعدہ کیا۔

ملزم جس سے اقبالِ جرم کرایا گیا تھا اتنا غریب آدمی تھا کہ معمولی سا وکیل کرنے کی بھی ہمت نہیں رکھتا تھا اور اُس کی مدد کرنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ اُس وقت عبدالقدیر کے والد اشفاق علی کی وکالت عروج پر تھی اور وہ ضلع میں مسلم لیگ کے عہدیدار بھی تھے۔ سیاست میں سرگرم رہتے تھے اور نظریۂ پاکستان کے شیدائی تھے۔ عبداللہ غازی وفد کے ساتھ انہیں ملے اور پورا کیس سنا کر اُن سے درخواست کی کہ وہ اس مزارع کے صفائی کے وکیل ہو جائیں لیکن فی سبیل اللہ، اگر انہیں فیس یا عدالتی اخراجات کی ضرورت ہو تو قصبے کے مسلمان ادا کریں گے۔ اشفاق علی نے خندہ پیشانی سے کیس بلا اُجرت لے لیا اور یہ بھی کہا کہ وہ عدالتی اخراجات اپنی جیب سے ادا کریں گے۔

اشفاق علی ڈسٹرکٹ کورٹ یعنی مجسٹریٹوں کی کورٹوں کے کیس نہیں لیا کرتے تھے۔ اُن کی پریکٹس سیشن اور ہائی کورٹ کی تھی۔ اُنہوں نے یہ کیس قبول کر لیا۔ ان کے دو مددگار وکیل تھے۔ ایک کلرک اور ایک منشی بھی تھا۔ اُنہوں نے اُسی روز ملزم کی صفائی کے لیے معلومات اکٹھی کرنی شروع کر دیں۔ خود ملزم کے گاؤں گئے۔ اُس کی بیوی اور بیٹی سے ملے اور اُن سے بہت کچھ پوچھا۔ پھر جیل جا کر مزارع سے بڑی لمبی ملاقات کی اور اُسے یہ ہدایت دی کہ وہ مجسٹریٹ کی کورٹ میں کوئی بیان نہ دے اور کہے کہ اُسے جو کچھ کہنا ہے وہ سیشن کورٹ میں کہے گا اور جب وہ سیشن کورٹ میں جائے تو وہاں جرم قبول کرنے سے انکار کر دے

اور اقبالِ جرم کے متعلق کہے کہ اُس نے کوئی اقبالِ جرم نہیں کیا۔ تھانیدار نے اور مجسٹریٹ نے کورے کاغذ پر اُس کا انگوٹھا لگوایا تھا۔

مجسٹریٹ کی عدالت میں کیس بعض وجوہات کی بنا پر چھ ماہ بعد گیا۔ اُن دنوں اُس وقت کے لوگ بتاتے ہیں کہ مقدمات کی سماعت شروع ہونے میں وقت نہیں لگا کرتا تھا لیکن یہ کیس رُکا رہا۔ اِس دوران اشفاق علی نے اِدھر اُدھر سے بے شمار معلومات حاصل کر لی تھیں۔ عام طور پر وکیل اتنی کاوش نہیں کیا کرتے۔ انہیں سائل جو کچھ بتاتے ہیں وہ اس پر اپنا کیس تیار کرتے ہیں۔ اشفاق علی نے جب استغاثہ کے گواہوں پر جرح کی تو سب حیران رہ گئے کہ وہ اتنی زیادہ معلومات کیسے فراہم کر لاتے ہیں۔

جس وقت مجسٹریٹ کی عدالت میں شہادت شروع ہوئی وہ تھانیدار جس نے تفتیش کی تھی کسی اور تھانے میں جا چکا تھا۔ وہ پنجابی مسلمان تھا۔ وہ گواہی کے لیے اُس تھانے میں سے آیا تھا۔ مجسٹریٹ کی عدالت میں اشفاق علی نے اپنے ایک اسسٹنٹ کو بھیجا تھا کیونکہ وہاں اُنہوں نے کسی گواہ پر جرح نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ملزم نے جرم قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ آخر کیس سیشن کورٹ میں گیا۔ وہاں جب شہادت شروع ہوئی تو اشفاق علی کورٹ میں موجود تھے۔ سیشن جج ایک ہندوستانی عیسائی تھا۔

اب میں آپ کو باقی کہانی گواہوں کی زبانی اور اشفاق علی کی جرح کی صورت میں سناتا ہوں:

تھانیدار نے تاریخ، دن اور وقت بتا کر بیان دیا ــــ "ابھی سُورج نہیں نکلا تھا کہ وقوعہ کے گاؤں کا نمبردار، چوکیدار اور پیر کے دو خاص مصاحب تھانے میں آئے۔ اُنہوں نے رپورٹ دی کہ پیر کی لاش ایک کھڈ میں پڑی ہے۔ جس آدمی نے لاش دیکھ کر انہیں اطلاع دی تھی وہ بھی اُن کے ساتھ آیا تھا۔ میں نے پیر کے دونوں مصاحبوں کی رپورٹ پر کیس رجسٹر

کرلیا اور ایف۔ آئی۔ آر تیار کی .... میں موقعۂ واردات پر گیا۔ وہاں پیر صاحب کی لاش اوندھے منہ پڑی تھی۔ تقریباً ایک گز لمبی رسّی لاش کے نیچے پڑی تھی۔ گردن پر رسّی کے نشان تھے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اسی رسّی سے مقتول کا گلا گھونٹا گیا ہے۔"

تھانیدار نے جو کاغذی کارروائی کی اس کی تفصیل بتا کر بیان میں کہا —"میں نے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی اور تفتیش شروع کر دی۔ پیر صاحب (مقتول) کے دونوں مصاحبوں نے اور نمبردار نے بھی اس ملزم پر پختہ شک کا اظہار کیا اور وجہ یہ بتائی کہ پیر صاحب نے اس سے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگا جو اس نے دینے کا وعدہ کیا لیکن مجبوری یہ بتائی کہ اس کے پاس جہیز کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ پیر صاحب نے اُسے دو ہزار روپیہ نقد دے کر کہا کہ جہیز اور زیور وغیرہ بنا لو۔ اُس نے رقم لے کر ٹال مٹول شروع کر دی۔ دونوں مصاحبوں نے بتایا کہ پیر صاحب نے اس کی بدنیتی بھانپ لی اور اسے کہا کہ دو ہزار روپیہ واپس کر دو۔ ملزم نے رقم واپس کرنے میں ٹال مٹول کی۔ دونوں مصاحب اس کے پاس رقم لینے جاتے تھے اور یہ انہیں دھمکیاں دیتا تھا۔ نمبردار نے مجھے بتایا کہ اُس نے بھی اسے رقم کی واپسی کے لیے کہا تھا مگر اُس نے نمبردار کو بھی ٹال دیا .... میں نے اسے شک میں شاملِ تفتیش کیا۔ میں نے جب اس پر جرح کی تو اس نے اقبالِ جرم کر لیا۔ میں اسے مجسٹریٹ (نام) کے پاس لے گیا۔ اُس نے دفعہ ۱۶۴ کے تحت اپنا اقبالی بیان ریکارڈ کرا دیا۔ اس کے بعد اسے جوڈیشل حوالات میں بھیج دیا گیا۔"

تھانیدار (ایس۔ ایچ۔ او) کا بیان طویل تھا۔ میں نے اس کے ضروری اور اہم اقتباس پیش کیے ہیں۔ اشفاق علی نے اس پر جرح شروع کی جو کم و بیش تین گھنٹوں میں مکمل ہوئی۔ میں اس کے بھی اہم حصے پیش کر رہا ہوں۔

"کیا ملزم نے تھانے میں جاتے ہی اقبالِ جرم کر لیا تھا؟"—

اشفاق علی نے پوچھا—"میرا سوال ذرا سمجھ لو۔ کیا ملزم نے اُسی دن یا اُسی رات اقبالِ جرم کر لیا تھا؟"

"اُسی رات"— تھانیدار نے جواب دیا۔

"اس کا ریمانڈ کتنے دنوں کا لیا گیا تھا؟"

"سات سات دنوں کا دو دفعہ ریمانڈ لیا گیا تھا۔"

"مجسٹریٹ کے پاس اس کا اقبالی بیان ریکارڈ کرانے کے لیے کب لے گئے تھے؟"

تھانیدار نے جو تاریخ بتائی وہ دوسری بار کے ریمانڈ کا آخری دن تھا۔

"اس نے اقبالِ جرم پہلے روز ہی کر لیا تھا"— اشفاق علی نے پوچھا—"اسے چودہویں روز مجسٹریٹ کے پاس کیوں لے گئے؟ دوسرے ہی دن کیوں نہ لے گئے؟"

"شہادت اکٹھی کرنی تھی"— تھانیدار نے جواب دیا— "برآمدگی کرنی تھی۔"

"برآمدگی کیسی؟"— اشفاق علی نے پوچھا—"تمہارے بیان کے مطابق مقتول کا گلا رسّی سے گھونٹا گیا تھا اور یہ رسّی تمہیں وہیں پڑی مل گئی تھی۔ کیا پوسٹ مارٹم رپورٹ میں موت کا باعث کچھ اور لکھا گیا تھا جس کے مطابق کسی اور آلۂ قتل کی تلاش تھی؟"

"نہیں"— تھانیدار نے جواب دیا—"پوسٹ مارٹم رپورٹ میں آلۂ قتل رسّی ہی لکھا گیا تھا۔"

"پھر اور کیا برآمد کرنا تھا؟"

"ملزم سے وہ رقم برآمد کرنی تھی جو اس نے مقتول سے لی تھی۔"

"رقم برآمد ہوئی؟"

"چھ سو سات روپے برآمد ہوئے تھے"— تھانیدار نے جواب دیا۔

"اس رقم کے ساتھ تمہارا تعلق تھا یا نہیں' اسے ابھی رہنے دو"۔۔۔ اشفاق علی نے کہا ۔۔۔"عدالت کو یہ بتاؤ کہ تم نے مجسٹریٹ کے پاس اس کا اقبالی بیان ریمانڈ کے آخری دن کیوں کرایا؟"

تھانیدار کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ ہر سوال کا جواب بے معنی سا دیتا رہا۔ اس موقعہ پر سیشن جج نے اسے کہا۔۔۔"اگر تمہیں ان کے سوال سمجھ نہیں آرہے تو ان سے پھر پوچھو۔ یہ جو کچھ پوچھ رہے ہیں، وہ تم نے ابھی تک نہیں بتایا۔"

"میں تم پر سیدھا سوال کرتا ہوں"۔۔۔ اشفاق علی نے کہا۔۔۔"ملزم اقبالِ جرم سے انکار کر رہا تھا کیونکہ جرم کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ تم اسے زدوکوب کرتے رہے اور اسے اذیتیں دیتے رہے۔"

"یہ غلط ہے"۔۔۔ تھانیدار نے کہا۔۔۔"زدوکوب کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ یہ میری جرح کو ہی برداشت نہیں کر سکا اور فوراً اقبالِ جرم کر لیا۔"

"پھر اس کی بیٹی کو تھانے بُلا کر اور اس کے تمام کپڑے اتار کر اس کے سامنے کھڑا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"یہ ایک جھوٹا الزام ہے جو مسلم لیگ والوں نے مجھ پر عائد کیا تھا"

۔۔۔ تھانیدار نے کہا۔۔۔"میں نے نہ ملزم کی بیٹی کو تھانے بلایا تھا، نہ اُس کے کپڑے اُتارے تھے۔"

"مسلم لیگ والوں کو تمہارے ساتھ کیا دشمنی تھی؟"

"میرے تھانے کے علاقے کے مسلمان زمیندار اور ان کی برادریاں یونینسٹ پارٹی سے تعلق رکھتی ہیں"۔۔۔ تھانیدار نے جواب دیا۔۔۔"مسلم لیگ والوں کو شک تھا کہ میں یونینسٹ پارٹی کی مدد کرتا اور مسلم لیگ کو دھمکاتا رہتا ہوں۔ چنانچہ اُنہوں نے مجھ پر یہ الزام عائد کر دیا۔"

تھانیدار نے سیاسی پارٹیوں کا ذکر اس لیے کیا تھا کہ سیشن جج عیسائی تھا۔ یونینسٹ پارٹی انگریزوں کی بنائی ہوئی تھی جس میں ہندو سکھ اور مسلمان جاگیرداروں اور حکومت کے حامی زمینداروں کو شامل کیا گیا تھا۔ چونکہ اس پارٹی کی پشت پناہی حکومت کر رہی تھی اس لیے اس میں عیسائی بھی شامل تھے۔ تھانیدار نے عیسائی سیشن جج کو متاثر کرنے کے لیے یہ جواب دیا تھا۔

"کیا تحقیقات ہوئی تھی؟"

"محکمانہ تحقیقات ہوئی تھی"۔۔۔ تھانیدار نے کہا۔"کچھ لوگوں نے میرے خلاف گواہیاں دی تھیں لیکن میرے خلاف الزام ثابت نہیں ہو سکا۔"

اشفاق علی نے کورٹ سے استدعا کی کہ وہ درخواست دینا چاہتے ہیں کہ اس تھانیدار کے خلاف جو انکوائری ہوئی تھی، اس کی فائل کورٹ میں منگوائی جائے تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ اقبالِ جرم صرف جسمانی ایذا رسانی سے حاصل نہیں کیا گیا بلکہ ملزم کو اس قسم کا جذباتی اور روحانی صدمہ دیا گیا ہے کہ اس کی کنواری اور نوجوان بیٹی کو تھانے میں اس کے سامنے ننگا کر کے کھڑا کیا گیا اور اس کے ساتھ دو برہنہ کانسٹیبل کھڑے کیے گئے۔ اس قدر ذلت آمیز ماحول پیدا کر کے ملزم کو مجبور کیا گیا کہ وہ اس تھانیدار کی مرضی کا اقبالی بیان دے۔

پبلک پراسیکیوٹر (سرکاری وکیل جو ہندو تھا) نے اس کی مخالفت میں کہا کہ گواہ (تھانیدار) کے خلاف کسی عدالت میں کوئی مقدمہ نہیں چلا نہ اسے کسی عدالت نے اس جرم میں سزا دی ہے۔ اس کے خلاف محکمانہ کارروائی ہوئی تھی جو عدالت میں نہیں منگوائی جا سکتی۔ گواہ کے بیان کے مطابق اس کا پسِ منظر سیاسی ہے۔ قتل کا یہ کیس غیر سیاسی ہے۔

سیشن جج نے کہا۔۔۔"پبلک پراسیکیوٹر کا مؤقف بہت کمزور ہے اس لیے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے گواہ کے خلاف جو تحقیقات اور کارروائی ہوئی تھی، وہ کورٹ میں آنی چاہیئے۔ اس کا تعلق ملزم کے اقبالِ جرم کے ساتھ ہے۔"

اشفاق علی نے اپنے اسسٹنٹ سے کہا کہ وہ درخواست لکھے۔ انہوں نے تھانیدار پر جرح جاری رکھی۔

"ملزم کا مکان کیسا ہے؟" — اشفاق علی نے پوچھا "تم نے تلاشی لی تھی۔ گھر کا سامان وغیرہ کیسا ہے؟"

"کچا کوٹھا ہے" — تھانیدار نے جواب دیا — "ایک ہی کمرہ ہے۔ صحن نہیں۔ اندر تین چارپائیاں ہیں۔ سامان مٹی کے چند ایک برتن ہیں۔"

"یعنی یہ گھر ایک بہت ہی غریب آدمی کا گھر ہے" — اشفاق علی نے کہا۔

"بہت غریب" — تھانیدار نے کہا — "اتنا غریب کہ اس نے بیٹی کا جہیز بنانے کے لیے پیر صاحب سے رقم لی تھی۔"

"ملزم کا کوئی جوان بیٹا یا بھائی ہے؟"

"نہیں" — تھانیدار نے جواب دیا — "میں نے معلوم کیا تھا۔ یہ خود ہے، اس کی بیوی اور بیٹی ہے۔"

اس موقع پر سرکاری وکیل بول پڑا۔ اس نے جج سے کہا — "فاضل ایڈووکیٹ یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ملزم بہت غریب اور نادار ہے اور اس کا کوئی بیٹا اور بھائی بھی نہیں، اس لیے یہ پیر کی حیثیت کے آدمی کو پہلے دھمکیاں دینے پھر قتل کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ میں عدالت کی توجہ اس طرف کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ فاضل ایڈووکیٹ محترم اشفاق علی ہائی کورٹ کے وکیل ہیں اور بہت مہنگے۔ کوئی غریب آدمی ان کی خدمات حاصل کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ملزم اگر غریب ہی ہے تو اسے کسی مالدار پارٹی کی مدد حاصل ہے۔"

یہ ایک بے موقع اور بے محل دلیل تھی جو سرکاری وکیل نے دی۔

جج نے کہا — "یہ بحث اور دلائل کا نکتہ ہے جو آپ آخر میں پیش کر سکتے ہیں۔ اس کا یہ موقع نہیں۔"

"میں فاضل پی پی (پبلک پراسیکیوٹر) کا یہ نکتہ یہیں ختم کر دیتا ہوں" — اشفاق علی نے کہا — "میں ملزم سے فیس نہیں لے رہا۔ دیگر اخراجات بھی اپنی جیب سے کر رہا ہوں۔ میرے پاس ایک وفد یہ درخواست لے کر آیا تھا کہ ایک غریب اور نادار آدمی کو بڑے ہی ذلیل طریقے سے مجبور کر کے اس سے اقبالِ جرم پر انگوٹھا لگوا لیا گیا ہے اور یہ غریب آدمی ایسا وکیل کرنے کی ہمت نہیں رکھتا جو اسے بے گناہ ثابت کر سکے۔ یہی وفد ڈی۔ ایس۔ پی کے پاس بھی گیا تھا۔ میں نے یہ کیس انسانی ہمدردی کی خاطر مفت لیا ہے تاکہ ایک نادار آدمی انصاف سے محروم نہ رہے۔"

اشفاق علی نے تھانیدار سے پوچھا — "تم نے مقتول کے دو خاص مصاحبوں کی رپورٹ پر کیس لیا تھا۔ کیا تم نے یہ ضروری نہیں سمجھا کہ مقتول کے کسی قریبی رشتہ دار کو بلا لیتے؟ کیا یہ دو آدمی تمہارے لیے زیادہ قابلِ اعتماد تھے؟"

"چونکہ نمبردار اور چوکیدار کے علاوہ وہ آدمی بھی ساتھ تھا جس نے لاش دیکھی تھی اس لیے میں نے ان دو مصاحبوں کو قابلِ اعتماد سمجھا۔ مقتول کے کسی عزیز رشتہ دار کی ضرورت نہیں تھی۔"

"کیا تم ان دونوں کو پہلے سے جانتے تھے؟"

"نہیں۔"

"تمہارے تھانے میں سزا یافتہ اور دیگر ہسٹری شیٹر افراد کا جو ریکارڈ ہے، تم نے وہ کبھی دیکھا ہے؟"

"میں اس سے واقف ہوں" — تھانیدار نے جواب دیا۔

"کیا ان دونوں مصاحبوں کے نام اس ریکارڈ میں نہیں ہیں؟"

تھانیدار کے چہرے پر صاف گھبراہٹ ظاہر ہوئی۔ اشفاق علی نے سوال دہرایا تو بھی وہ نہ بولا۔ سیشن جج بول پڑا۔

"کیا تم نے ان کا سوال سمجھا ہی نہیں؟" جج نے کہا — "سوال دوبارہ کراؤں یا جواب دو۔"

"یہ دونوں آدمی تھانے کے ریکارڈ پر ہیں"۔ تھانیدار نے کہا۔ اشفاق علی نے تفصیل پوچھی تو تھانیدار نے بتایا کہ ان میں سے ایک دو بار سزا یافتہ ہے اور دوسرا ایک بار۔ دونوں چوری چکاری کرتے رہے ہیں۔

"اور دونوں تمہارے مخبر بھی ہیں۔"

"باقاعدہ مخبر نہیں۔"

"بے قاعدہ ہی سہی"۔ اشفاق علی نے کہا۔ "تمہارے لیے مخبری کرتے رہے ہیں۔"

"جی!"۔ تھانیدار نے جواب دیا۔ "کرتے رہے ہیں۔"

"مقتول کی کتنی بیویاں ہیں؟"

"مجھے اچھی طرح معلوم نہیں"۔ تھانیدار نے جواب دیا۔

"جس پیر کے خاص مصاحب تمہارے مخبر ہیں، اُس کے گھر کے متعلق تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ اُس کی کتنی بیویاں ہیں"۔ اشفاق علی نے کہا۔ "چلو مان لیتا ہوں۔ کورٹ کو یہ بتاؤ کہ تم نے مقتول کے گھر کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ قتل کا باعث گھر کے حالات ہو سکتے تھے۔ بیویوں کی رقابت ہو سکتی تھی۔ تم نے کیا سمجھ کر معلوم نہیں کیا کہ پیر کی کتنی بیویاں ہیں؟"

سرکاری وکیل نے اس سوال پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ یہ سوال ریکارڈ میں نہ لایا جائے کیونکہ ملزم کا اقبالی بیان زیر دفعہ ۱۶۴ موجود ہے جس میں قتل کا باعث بیان کیا گیا ہوگا۔

"ملزم کہہ چکا ہے کہ اُس نے کسی مجسٹریٹ کے سامنے اقبالِ جرم نہیں کیا"۔ اشفاق علی نے کہا۔ "لہٰذا اقبالی بیان شہادت میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ میں کورٹ سے درخواست کروں گا کہ جس مجسٹریٹ نے بیان قلمبند کیا ہے اُسے گواہ کے طور پر نہ بلایا جائے۔"

سیشن جج نے رُولنگ دی کہ مجسٹریٹ کو گواہ کے طور پر ضرور بلایا جائے گا اور صرف اقبالی بیان پر ملزم کو سزا نہیں دی جائے گی۔ مکمل شہادت دیکھی جائے گی اور پی پی کا یہ اعتراض مسترد کیا جاتا ہے کہ صفائی کا وکیل یہ سوال نہ پوچھے۔

اشفاق علی نے اپنا سوال دُہرایا تو تھانیدار نے جواب دیا۔

"چونکہ ملزم نے پہلی رات ہی اقبالِ جُرم کر لیا تھا اس لیے میں نے مقتول کے گھر کے حالات وغیرہ معلوم کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔"

اس کے بعد مختلف پیشیوں پر گواہ گزرتے رہے۔ اُس آدمی کا بھی بیان ہُوا جس نے سب سے پہلے لاش دیکھی اور نمبردار کو بتایا تھا۔ اشفاق علی نے اس سے پوچھا کہ اس نے لاش کے قریب کوئی رسّی پڑی دیکھی تھی؟ اُس نے جواب دیا کہ دیکھی تھی۔ اشفاق علی نے پوچھا کہ کہاں پڑی تھی؟ اُس نے بتایا کہ لاش سے دو تین قدم دور دائیں طرف پڑی تھی اور پہلی نظر میں وہ اسے سانپ سمجھا تھا۔ اُسے رسّی دکھائی گئی۔ اُس نے شائد وہ رسّی اسی قسم کی تھی۔

وہ ڈاکٹر بھی عدالت میں آیا جس نے لاش کا پوسٹ مارٹم کیا تھا۔ اُس نے پوسٹ مارٹم رپورٹ پیش کی اور ویسا ہی بیان دیا جیسا ہر ڈاکٹر دیا کرتا ہے۔ اُس کے بیان کا لُبِّ لباب یہ تھا کہ مقتول کی موت رسّی سے گلا گھونٹنے سے واقع ہوئی ہے۔ اشفاق علی نے جرح شروع کی۔ ان کے چیدہ چیدہ سوال پیش کرتا ہوں۔

"کیا آپ ڈاکٹر کی حیثیت سے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ مقتول کا گلا اس رسّی سے گھونٹا گیا ہے؟"۔ اشفاق علی نے پوچھا اور اُسے وہ رسّی دکھائی گئی جو استغاثہ کے مطابق لاش کے نیچے پڑی تھی۔ یہ رسّی کورٹ میں "ایگزبٹ" کے طور پر موجود تھی۔

"جی نہیں"۔ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مقتول کا گلا اسی رسّی سے گھونٹا گیا ہے۔"

"کیا یہ ہو سکتا ہے کہ تار سے گلا گھونٹا گیا ہو؟"

"ہو سکتا ہے"۔ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"کیا یہ ہو سکتا ہے کہ پٹی کی طرح کوئی لمبا کپڑا مروڑ کر اس کی رسی بنالی گئی ہو اور اس سے گلا گھونٹا گیا ہو؟"

"یہ بھی ہو سکتا ہے"۔ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

اشفاق علی نے رسی ایک بار پھر اُس کے ہاتھ میں دے کر کہا۔ "ایک بار پھر اسے غور سے دیکھیں اور یقین سے بتائیں کہ مقتول کا گلا اسی رسی سے گھونٹا گیا ہے؟"

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔"

"یہ رسی آپ نے پہلے دیکھی تھی؟"

"نہیں"۔ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "میں یہ پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔"

"آپ کے اندازے کے مطابق موت پوسٹ مارٹم کے وقت سے کتنی دیر پہلے واقع ہوئی؟"

"اندازاً دس گھنٹے پہلے"۔ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"پوسٹ مارٹم کتنے بجے ہُوا؟"

"سوا دس بجے دن۔"

"گویا مقتول رات ایک بجے کے لگ بھگ قتل ہُوا؟"

"حساب تو یہی بتاتا ہے۔"

"اچھی طرح یاد کریں"۔ اشفاق علی نے کہا۔ "آپ نے لاش کا پیٹ چاک کیا، معدہ دیکھا اور سب کچھ دیکھا۔ ظاہر ہے بدبو ہو گی۔ عدالت کو یہ بتائیں کہ اس بُو میں شراب کی بدبُو بھی تھی؟"

"شراب کی بُو نمایاں تھی"۔ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

سیشن جج نے مسکرا کر ڈاکٹر سے پوچھا۔ "آپ کو شراب کی بُو کیسے یاد رہ گئی ہے؟ کیا آپ پیٹ کی بدبُو سے شراب کی بدبُو الگ کر کے بتا سکتے ہیں؟"

"جناب والا!"۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "جسم کے سسٹم میں شراب کی موجودگی معلوم کرنے کے طریقے اور ہیں۔ خون ٹیسٹ کیا جاتا ہے۔ معدے میں جو مواد ہوتا ہے اس میں سے کچھ نکال کر ماہرین کے پاس بھیجا جاتا ہے۔ میں نے ایسا کوئی طریقہ اختیار نہیں کیا کیونکہ مجھے پولیس کی طرف سے ایسی کوئی ہدایت نہیں ملی تھی۔ مجھے یہ بدبُو اس طرح یاد رہ گئی ہے کہ میں نے معدہ چیرا تو بدبُو نارمل نہیں تھی۔ اس میں شراب کی بدبُو تھی۔ میرے ساتھ جو ڈسپنسر مددگار تھا، وہ بھی ہندو ہے۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ دیکھو مسلمانوں کے پیر جو اپنے آپ کو خدا کا مقدس آدمی سمجھتے ہیں کتنی زیادہ شراب پیتے ہیں .... میں نے اگر مسلمانوں کے عقیدے یا مذہب کی توہین کی ہے تو میں فاضل ایڈووکیٹ صفائی سے دست بستہ معافی مانگتا ہوں۔"

سیشن جج نے سنجیدگی سے اشفاق علی کی طرف دیکھا۔ اشفاق علی نے کہا۔ "جناب والا! میں یہی ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ خدا کے یہ نام نہاد مقدس آدمی جو پیر و مرشد بنے ہوئے ہیں اتنی زیادہ شراب پیتے ہیں کہ ان کی لاشوں کے اندر کی بدبُو شراب کی بُو میں دب جاتی ہے۔"

سرکاری وکیل نے اعتراض کیا کہ شراب کی موجودگی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں شامل نہیں اس لیے یہ ریکارڈ میں نہیں آنی چاہیئے۔ جج نے اعتراض مسترد کرتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر نے اتنے وثوق سے شراب کی موجودگی بتائی ہے کہ اسے ریکارڈ پر لانا ضروری ہو گیا ہے۔"

ایک پیشی پر اُس مجسٹریٹ کا بیان ریکارڈ کیا گیا جس نے ملزم کا اقبالی بیان زیر دفعہ ۱۶۴ قلمبند کیا تھا۔ اُس نے وہ سربمہر لفافہ عدالت میں پیش کیا جس میں ملزم کا اقبالی بیان بند تھا۔ جج نے مجسٹریٹ سے کہا کہ وہ لفافہ کھول کر اقبالی بیان سنائے۔ مجسٹریٹ نے بیان پڑھا۔ یہ خاصہ طویل تھا۔ اس کا اختصار ملزم کے الفاظ میں (اگر الفاظ ملزم کے ہی تھے)

یوں ہے:

"میری کُل اولاد ایک بیٹی ہے جو جوان ہو گئی ہے۔ میں نے اس کی منگنی فلاں گاؤں میں کر دی لیکن شادی کے لیے میرے پاس پیسے نہیں تھے۔ اگر میرے پاس تھوڑی سی بھی زمین ہوتی تو میں یہ گروی رکھ کر سود پر ساہوکار سے قرض لے لیتا۔ کسی اور سے قرض لیتے ڈر لگتا تھا کہ ادا کیسے کروں گا۔ ہم لوگ مشکل کے وقت اپنے پیر دستگیر کے دربار میں جایا کرتے ہیں۔ میں پیر صاحب (مقتول) کے ڈیرے پر گیا اور ان کے قدموں میں ماتھا رگڑ کر کہا کہ یا دستگیر، دعا کرو، میری بیٹی کی ڈولی عزت سے اٹھ جائے۔ پاس پلّے کچھ بھی نہیں۔ پیر صاحب نے کہا کہ بیٹی کو ساتھ لاؤ۔ ہم اپنے ہاتھ سے اُس کے گلے میں تعویذ ڈالیں گے۔ مشکل آسان ہو جائے گی....

"میری بیٹی کو خدا نے ایسی شکل اور ایسا قد کاٹھ دیا ہے کہ سب مجھے کہا کرتے ہیں کہ بیٹی کو باہر نہ جانے دیا کرو۔ میں نے سرکار (پیر) کا حکم مانا اور بیٹی کو اُن کے آستانے پر لے گیا۔ اُنہوں نے لڑکی کے سر اور منہ پر ہاتھ پھیرا اور جلال میں آکر کہنے لگے کہ یہ لڑکی بڑی بھاگوان ہے۔ یہ تو راج کرے گی۔ پھر دستگیر نے کہا کہ ہم دو ہزار روپیہ دیتے ہیں۔ جہیز بنا لو لیکن ابھی شادی کا دن مقرر نہ کرنا۔ میں دن مقرر کروں گا....

"میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ سرکار! میں اتنی رقم واپس کہاں سے کروں گا۔ میں تو صرف دُعا کرانے آیا ہوں۔ پیر صاحب نے ضد کی کہ دو ہزار روپیہ تمہیں لینا پڑے گا۔ میں نے اُن کا حکم تو مان لیا لیکن دو کی بجائے اُن سے ایک ہزار روپیہ لیا۔ چار پانچ روز بعد نمبردار نے مجھے اپنے گھر بلایا اور کہا کہ پیر صاحب نے تمہاری بیٹی کا رشتہ اپنے لیے مانگا ہے۔ میں نے نمبردار سے کہا کہ میں تو بیٹی کی منگنی بھی کر چکا ہوں۔ میں اب منگنی نہیں توڑ سکتا۔ نمبردار نے پیار سے کہا کہ بیوقوف نہ بن، بیٹی پیر صاحب کو دے دے۔ تیرے بھی وارے نیارے ہو جائیں

گے۔ پیر صاحب تمہیں اپنے دربار میں بٹھائیں گے....

"میں بڑی مشکل میں پھنس گیا۔ ایک طرف پیر صاحب تھے، دوسری طرف میری زبان تھی جو میں دے چکا تھا اور دعائے خیر بھی پڑھی گئی تھی۔ میں نے اللہ اور رسولؐ کے نام پر بیٹی کی زبان دے دی تھی۔ میں پیر صاحب کی بجائے خدا سے ڈر گیا اور نمبردار سے کہا کہ میں منگنی نہیں توڑوں گا اور رشتہ پیر صاحب کو نہیں دے سکتا۔ نمبردار نے مجھے گالی دے کر کہا کہ تم نے پیر صاحب سے دو ہزار روپیہ اس لیے لیا ہے کہ اپنی بیٹی کا رشتہ انہیں دو گے۔ اب تم رقم ہضم کر کے وعدے سے پھر گئے ہو۔ میں نے قسمیں کھا کر کہا کہ پیر صاحب کے پاس میں دُعا کرانے گیا تھا اور انہوں نے مجھے ایک ہزار روپیہ قرض دیا ہے کہ بیٹی کا جہیز بنا لو....

"نمبردار نے مجھے پیٹنا شروع کر دیا اور کہا کہ اپنی بیٹی کا رشتہ فوراً پیر صاحب کو دے دو۔ میں نے نمبردار کے پاؤں پکڑے۔ منّت کی کہ مجھے لوگوں میں ذلیل نہ کریں۔ میں زبان دے چکا ہوں مگر نمبردار مجھے ٹھڈ اور تھپڑ مارتا رہا۔ اُس روز کے بعد میری مصیبت آ گئی۔ پیر صاحب کے دو خاص آدمی (جنہوں نے قتل کی رپورٹ لکھوائی تھی) باری باری میرے گھر آتے اور پیر صاحب کے لیے رشتے کا مطالبہ کرتے۔ مجھے، میری بیوی اور میری بیٹی کو گالی گلوچ کر کے چلے جاتے۔ پیر صاحب نے مجھے اپنے آستانے پر بُلا کر ان دونوں سے پٹوایا اور کہا کہ تم وعدے سے پھر گئے ہو۔ میں نے ان کے قدموں پر سر رگڑا۔ فریادیں کیں مگر ان ظالموں پر کچھ اثر نہ ہُوا....

"ایک دن ایسے ہُوا کہ میں نے جس لڑکے کے ساتھ اپنی بیٹی کی منگنی کی تھی، اُس کا باپ میرے پاس آیا اور مجھے کہا کہ وہ میری بیٹی کو قبول نہیں کرے گا۔ وہ رو پڑا۔ میں نے وجہ پوچھی تو اُس نے بتایا کہ پیر صاحب اور نمبردار نے اُسے دھمکیاں دی ہیں کہ اُس نے اس لڑکی کے ساتھ اپنے بیٹے کی شادی کی تو لڑکی کو اغوا کر لیا جائے گی۔ وہ بے چارہ میری طرح

مزارع ہے۔ وہ ڈر گیا اور اُس نے منگنی توڑ دی۔ میں نے قسم کھائی کہ اپنی بیٹی کو زہر دے کر مار ڈالوں گا، پیر صاحب اور نمبردار کی بات نہیں مانوں گا۔ میں نے پیر صاحب سے ایک ہزار روپیہ لیا تھا۔ وہ میں انہیں واپس دینے گیا تو اُنہوں نے کہا کہ میں نے دو ہزار روپیہ دیا تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے آدمیوں سے پٹوایا اور کہا کہ پوری رقم لاؤ....

"یہ لوگ مجھ سے دو ہزار روپیہ مانگ رہے تھے۔ انہوں نے مجھے ہر کسی کے سامنے بدنام کر دیا۔ سب کہنے لگے کہ تم نے پیر صاحب کا دو ہزار روپیہ ہضم کر لیا ہے۔ اب اس کا نتیجہ دیکھنا۔ تمہاری بیٹی آباد نہیں ہو گی اور تم کوڑھی ہو کر مرو گے۔ میں ڈر سے مرتا رہا اور غصے سے جلتا رہا۔ وقوعہ کی رات کھیتوں کو پانی لگانا تھا۔ میرا کوئی بیٹا نہیں بیٹی میرے ساتھ چل پڑی۔ آدھی رات کا وقت ہو گا کہ پیر صاحب وہاں پہنچ گئے۔ وہ پہلے مجھے آوازیں دیتے رہے اور گالیاں بھی دے رہے تھے۔ چاندنی رات تھی۔ وہ قریب آئے تو کہنے لگے کہ میں تمہاری بیٹی کو لینے آیا ہوں۔ ان کی آواز سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ شراب کے نشے میں ہیں....

"پیر صاحب نے میری بیٹی کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹ کر اپنے ساتھ لے چلے۔ میں ان کی منتیں خوشامدیں کرتا رہا لیکن ان پر کچھ بھی اثر نہ ہُوا۔ میرے ہاتھ میں کدال تھی۔ اس کے دستے پر ایک رسّی لپٹی ہوئی تھی۔ میں نے یہ رسّی کھول لی۔ اُس وقت پیر صاحب اُسی کھڈ کے منہ پر جا رہے تھے جہاں سے ان کی لاش ملی ہے۔ میں نے پیچھے سے رسّی ان کی گردن میں پھینکی اور اس کا پھندا بنا کر بہت تیزی سے مروڑتا رہا۔ پیر صاحب گر پڑے۔ میں نے پھندا بہت تنگ کر دیا۔ میری بیٹی مجھے روکتی رہی کہ اسے جان سے نہ مارو، پھانسی چڑھ جاؤ گے۔ میں نے انہیں جان سے مار دیا۔ میں نے رسّی گردن میں ہی رہنے دی اور کھیتوں میں پانی لگانے چلا گیا۔ اپنی بیٹی سے میں نے کہا کہ وہ گھبرائے نہیں اور

اپنی ماں کو بھی نہ بتائے۔ دوسرے دن مجھے گرفتار کر لیا گیا اور میرے دل پر اس جرم کا اتنا بُرا اثر تھا کہ میں نے اقبالِ جرم کر لیا.... مجھ پر کسی نے کوئی زیادتی یا زبردستی نہیں کی اور میں یہ بیان اپنی مرضی سے دے رہا ہوں۔"

یہ اقبالی بیان کے مختصر اقتباسات ہیں جو مجسٹریٹ نے عدالت میں پڑھ کر سُنائے۔ اُس نے اپنے بیان میں کہا کہ اُس نے ملزم کی ہتھکڑی کھلوا کر اپنے چیمبر میں بٹھایا اور اسے خبردار کیا کہ اُس نے اقبالی بیان دیا تو اُسے عمر قید یا سزائے موت ہو سکتی ہے۔ مجسٹریٹ نے کہا کہ اُس نے ملزم کو یہ بھی بتایا کہ اگر وہ اقبالی بیان نہ دینا چاہے تو وہ آزاد ہے۔ اس صورت میں اسے پولیس کے حوالے نہیں کیا جائے گا بلکہ جیل کی حوالات میں بھیج دیا جائے گا جہاں اُسے کوئی تنگ نہیں کرے گا۔ اسے چیمبر میں بٹھا کر دو گھنٹے سوچنے کی مہلت دی گئی۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ وہ بیان دینا چاہتا ہے۔ اس نے بیان دیا جو اسے پڑھ کر سُنایا گیا اور اس نے خوشی سے اس پر انگوٹھا لگا دیا۔

"ملزم کو آپ کے پاس کون لے گیا تھا؟" — اشفاق علی نے پوچھا۔

"ایس۔ ایچ۔ او" — مجسٹریٹ نے تھانیدار (گواہ نمبر۱) کا نام لیا۔

"بیان قلمبند کرنے کے دوران یہ تھانیدار کہاں تھا؟"

"باہر کھڑا تھا" — مجسٹریٹ نے جواب دیا۔

"کیا وہ چیمبر سے آپ کو باہر کھڑا نظر آ رہا تھا؟"

"کھڑکی میں سے نظر آتا تھا۔"

"اس کھڑکی کی طرف ملزم کی پیٹھ تھی یا منہ تھا؟"

"میں جانتا ہوں آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں" — مجسٹریٹ نے مُسکرا کر کہا — "میں مجسٹریٹ ہوں۔ غلط بات نہیں کروں گا۔ ملزم ایسی جگہ بیٹھا تھا کہ وہ کھڑکی میں سے تھانیدار کو باہر کھڑا دیکھ سکتا تھا۔"

"مجھے خوشی ہے کہ آپ کو اپنے رُتبے کا احساس ہے اور آپ

قانون کا احترام کرتے ہیں"۔۔۔ اشفاق علی نے پوچھا۔۔۔ "اب عدالت کو یہ بتائیے کہ آپ دیکھ رہے تھے کہ ملزم کو تھانیدار سامنے کھڑا نظر آ رہا ہے تو آپ نے تھانیدار کو وہاں سے ہٹایا کیوں نہ دیا؟"

"میں نے ملزم کے دل سے پولیس کا خوف دُور کر دیا تھا"۔۔۔ مجسٹریٹ نے جواب دیا۔

"آپ مجسٹریٹ ہیں، سائیکالوجسٹ نہیں کہ آپ وثوق سے کہہ سکیں کہ ملزم خوف سے آزاد ہو گیا ہے"۔۔۔ اشفاق علی نے کہا۔۔۔ "کیا آپ نے محسوس نہیں کیا کہ تھانیدار کی موجودگی ملزم پر یہ تاثر پیدا کر رہی ہے کہ تھانیدار اس لیے باہر کھڑا ہے کہ اُس نے اقبالِ جرم نہ کیا تو تھانیدار اسے پھر تھانے لے جائے گا اور مارے پیٹے گا؟"

"میں نے ملزم کو جو یقین دلایا تھا مجھے اس پر بھروسہ تھا"۔۔۔ مجسٹریٹ نے جواب دیا۔

"آپ اخبار تو پڑھتے ہوں گے؟"

"جی"۔۔۔ مجسٹریٹ نے جواب دیا۔۔۔ "میں 'ٹربیون' اخبار پڑھتا ہوں"۔

"ٹربیون" انگریزی کا اخبار تھا۔ اشفاق علی نے اس اخبار کا ایک تراشہ مجسٹریٹ کے آگے رکھا اور کہا۔۔۔ "یہ خبر اسی اخبار میں شائع ہوئی تھی۔ آپ نے پڑھی تھی؟"

اشفاق علی نے یہ تراشہ مجسٹریٹ سے لے کر سیشن جج کو پڑھ کر سنایا۔ یہ خبر تھی کہ فلاں گاؤں میں ایک پیر قتل ہو گیا ہے۔ مبیّنہ طور پر اُسے اُس کے ایک مرید نے گلے میں پھندا ڈال کر قتل کیا ہے۔ پولیس کا بیان ہے کہ ملزم نے اقبالِ جرم کر لیا ہے لیکن مسلم لیگ کے ایک وفد نے علاقے کے ڈی۔ ایس۔ پی سے ملاقات کی اور متعلقہ تھانیدار پر الزام عائد کیا ہے کہ اُس نے ملزم پر تشدّد کیا ہے اور ملزم کی نوجوان بیٹی کو تھانے بلا کر اسے برہنہ کیا اور ملزم کے سامنے کھڑا کر دیا تھا۔ لڑکی کے ساتھ دو

کانسٹیبلوں کو بھی برہنہ حالت میں کھڑا کر دیا گیا تھا۔ مسلمانوں نے الزام عائد کیا ہے کہ ملزم نے اپنی بیٹی کی عزّت بچانے کی خاطر اقبالی بیان دیا ہے جو دراصل تھانیدار نے لکھا ہے۔ اس تھانیدار کو لائن حاضر کر دیا گیا ہے اور تحقیقات کا حکم دے دیا گیا ہے۔

اشفاق علی نے مجسٹریٹ سے پوچھا۔۔۔ "تراشے پر تاریخ دیکھیں۔ یہ خبر اس سے تین روز پہلے کی ہے جب ملزم آپ کے پاس اقبالی بیان ریکارڈ کرانے کے لیے لایا گیا تھا۔ خبر میں تھانیدار کا، تھانے کا اور ملزم کا نام بھی دیا گیا ہے۔ آپ ان تینوں ناموں سے آگاہ تھے۔ عدالت کو یہ بتائیں کہ جب یہی تھانیدار آپ کے پاس اس ملزم کو لایا تو آپ نے اس سے پوچھا نہیں کہ یہ خبر کہاں تک سچ ہے؟ کیا واقعی اُس کی بیٹی کے ساتھ تھانیدار نے یہ سلوک کیا تھا؟"

"نہیں"۔۔۔ مجسٹریٹ نے جواب دیا۔۔۔ "میں نے اس سے نہیں پوچھا تھا"۔

"اگر میں کہوں کہ آپ نے مجسٹریٹ کی حیثیت سے اپنے فرض میں کوتاہی کی ہے تو آپ کیا جواب دیں گے؟"

"ظاہر ہے کہ میں کہوں گا کہ میں نے کوتاہی نہیں کی"۔۔۔ مجسٹریٹ نے جواب دیا۔۔۔ "اخبار کی خبر میرے لیے قانون کی حیثیت نہیں رکھتی"۔

"میں آپ سے کہتا ہوں کہ ملزم کو آپ کے پاس لے جایا ہی نہیں گیا"۔

"میں اس الزام کی تردید کرتا ہوں"۔۔۔ مجسٹریٹ نے کہا۔۔۔ "ملزم کو میرے پاس لایا گیا تھا"۔

"پھر آپ نے تھانیدار کو کھڑکی کے سامنے ایسی جگہ کیوں کھڑا کیے رکھا جہاں سے ملزم اُسے اور وہ ملزم کو دیکھ سکتا تھا؟"

"یہ میرا دانستہ اقدام نہیں تھا"۔۔۔ مجسٹریٹ نے جواب دیا۔

"کیا آپ نے یہ بھی نہیں سوچا کہ ملزم اَن پڑھ، کم فہم اور بہت

غریب آدمی ہے جس کی زندگی مسلسل خوف میں بسر ہو رہی ہے؟"

"ملزم کی حیثیت کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں تھا"۔۔۔ مجسٹریٹ نے جواب دیا۔

اس کے بعد نمبردار کی گواہی ہوئی۔ یہ ایک اہم گواہ تھا کیونکہ اس کا ذکر اقبالی بیان میں آیا تھا۔ سرکاری وکیل کی راہنمائی میں اُس نے مختصر سا بیان دیا کہ فلاں دن اُسے فلاں آدمی نے آ کر بتایا کہ پیر صاحب کی لاش کھڈ میں پڑی ہے۔ نمبردار نے بتایا۔۔۔ "میں چوکیدار کو ساتھ لے کر وہاں گیا۔ پیر صاحب کی لاش پیٹ کے بل پڑی تھی۔ اس کے ساتھ ایک رسّی تھی۔ میں نے پیر صاحب کے گھر جا کر اطلاع دی۔ ان کے دو مصاحب میرے ساتھ آئے۔ اُنہوں نے بھی لاش دیکھی، پھر میں ان دونوں کے ساتھ تھانے گیا۔ تھانیدار صاحب نے ان دونوں کی رپورٹ پر مقدمہ درج کیا۔ میرا فرض یہیں پر ختم ہو گیا۔ قاتل یہی ملزم ہے۔ اس نے اقبالِ جُرم کیا ہے"۔

اِس کی گواہی میں باقی باتیں غیر اہم تھیں۔ اشفاق علی نے جرح شروع کی۔

"رسّی کہاں پڑی تھی؟"

"لاش کے ساتھ تھی"۔۔۔ نمبردار نے جواب دیا۔

"ساتھ سے تمہاری کیا مُراد ہے"۔۔۔ اشفاق علی نے پوچھا۔۔۔ "کیا رسّی لاش کے گلے میں تھی؟"

"جی"۔۔۔ اُس نے ذرا جھجک کر جواب دیا۔۔۔ "گلے میں ہی تھی"۔

"تم نے کہا ہے کہ قاتل یہی ملزم ہے"۔۔۔ اشفاق علی نے کہا۔۔۔ "تم نے یہ فیصلہ کیوں دے دیا ہے؟"

"ملزم نے اقبالی بیان دیا ہے"۔

"تم نے یہ بیان پڑھا تھا؟"

"نہیں"۔

"کیا ملزم نے تمہارے سامنے اقبالِ جُرم کیا تھا؟"

"نہیں"۔

"پھر تمہیں کس طرح پتہ چلا کہ ملزم نے اقبالِ جُرم کر لیا تھا؟"۔۔۔ اشفاق علی نے پُوچھا۔۔۔ "تھانیدار نے بتایا تھا؟"

"جی ہاں"۔۔۔ نمبردار نے جواب دیا۔۔۔ "تھانیدار نے بتایا تھا"۔

"ملزم پر قتل کے شک کا اظہار کس نے کیا تھا؟"

"پیر صاحب کے مصاحبوں نے"۔

"تم جانتے ہو ملزم کی پیر سے کیا دشمنی تھی؟"

"ملزم نے پیر صاحب سے دو ہزار روپیہ لے کر اپنی بیٹی کا رشتہ دینے کا وعدہ کیا تھا"۔۔۔ نمبردار نے جواب دیا۔۔۔ "لیکن ملزم رقم ہضم کر گیا اور رشتہ دینے سے انکار کر دیا"۔

"کیا رقم ملزم نے تمہارے سامنے لی تھی؟"

"نہیں"۔

"پھر تم کس طرح کہتے ہو کہ ملزم نے رقم لی تھی؟"

"پیر صاحب جھوٹ نہیں بولا کرتے"۔۔۔ نمبردار نے جواب دیا۔

"تم نے ملزم سے کہا تھا کہ رشتہ پیر کو دو یا رقم واپس کر دو؟"

"کہا تھا"۔۔۔ نمبردار نے جواب دیا۔۔۔ "لیکن ملزم ٹال مٹول کرتا رہا"۔

"تمہیں معلوم ہے کہ ملزم کچھ عرصہ پہلے اپنی بیٹی کی منگنی (فلاں) گاؤں میں کر چکا تھا؟"

"مجھے یاد نہیں"۔۔۔ نمبردار نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ منگنی ہوئی تھی مگر تمہیں یاد نہیں"۔۔۔ اشفاق علی نے کہا۔۔۔ "کیا تمہیں یہ بھی یاد نہیں کہ اس منگنی میں تم بھی شریک ہوئے تھے؟ اگر چاہو تو تمہیں یاد دلاتا ہوں کہ تمہارے ساتھ اور کون کون گیا تھا"۔

"مجھے یاد آگیا ہے" — نمبردار نے کہا — "ملزم کی بیٹی کی منگنی ہوئی تھی۔"

"اِس پیر کی کرامات کیا ہیں جو قتل ہو گیا ہے؟"

"ان کے والد اور دادا مُردے کو زندہ کر دیا کرتے تھے" — نمبردار نے جواب دیا۔

"کوئی ایک آدمی بتا سکتے ہو جو مر کر زندہ ہُوا ہو؟"

"نہیں۔"

"کیا مسلمان کے لیے شراب جائز ہے؟" — اشفاق علی نے پوچھا۔

"حرام ہے۔"

"اور شراب پینے والے مسلمان کو کیا کہو گے؟"

"گنہگار۔ کافر" — نمبردار نے جواب دیا۔

"کیا یہ صحیح ہے کہ مقتول پیر شراب پیا کرتا تھا؟" — اشفاق علی نے پوچھا — "اور تم بھی اس کے ساتھ شراب پیا کرتے تھے؟"

"نہ پیر صاحب پیتے تھے نہ میں پیتا ہوں" — نمبردار نے کہا۔

"کیا یہ صحیح ہے کہ تم نے اپنے مرے ہوئے بھائی کی بیٹی کو پالا ہے اور وہ اب جوان ہے؟"

"جی ہاں" — نمبردار نے جواب دیا — "یہ صحیح ہے۔"

"اور کیا یہ بھی صحیح ہے کہ اس پیر نے تم سے اس یتیم بھتیجی کا رشتہ مانگا تھا اور تم نہیں مانے تھے؟"

"جی صحیح ہے۔"

"اور کیا پیر نے تمہیں کہا تھا کہ اپنی بھتیجی کا رشتہ دو یا ملزم کی بیٹی کا رشتہ دلا دو؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہوئی" — نمبردار نے جواب دیا۔

"کیا یہ بھی صحیح نہیں کہ پیر کی چھوٹی بیوی سکینہ کو پتہ چل گیا تھا کہ تم پیر کی ایک اور شادی کا بندوبست کر رہے ہو، اور اُس نے تمہیں کہا تھا کہ ایسا نہ کرنا؟"

"یہ غلط ہے۔"

"کیا یہ بھی غلط ہے کہ سکینہ نے اس شرط پر تمہارے ساتھ ناجائز دوستانہ گانٹھ لیا تھا کہ تم پیر کی تیسری شادی نہیں ہونے دو گے؟"

"یہ بالکل غلط ہے" — نمبردار نے پریشان ہو کر کہا — "یہ میرے پیر دستگیر کی بے ادبی ہے۔"

"کیا یہ صحیح ہے کہ پیر شادی سے باز نہیں آ رہا تھا اس لیے سکینہ نے تمہیں رقم پیش کی تھی کہ پیر کو قتل کرا دو؟"

"یہ بالکل جھوٹ ہے۔"

"اور تم نے پیر کے ان دو مصاحبوں کے ساتھ مل کر پیر کو قتل کر دیا اور اس ملزم کو پھنسا دیا؟"

"یہ بھی غلط ہے۔"

"میں تمہیں کہتا ہوں کہ پیر کے قاتل تم ہو۔"

"نہیں حضور!" — نمبردار نے جواب دیا — "میں اُن کا مُرید تھا اور میں اس گدی کا ہمیشہ مرید رہوں گا۔"

"ملزم کی بیٹی کو تم تھانے خود لے گئے تھے یا تھانیدار نے کسی کانسٹیبل کو بھیجا تھا؟"

"میں نہیں لے گیا تھا" — اُس نے جواب دیا — "نہ مجھے معلوم ہے کہ کوئی کانسٹیبل اُسے لے گیا تھا۔"

"اپنے علاقے کے جرائم پیشہ لوگوں کو جاننا تمہارے فرائض میں شامل ہے" — اشفاق علی نے کہا — "پیر کے دونوں مصاحبوں کے متعلق تمہاری کیا رپورٹ ہے؟"

"دونوں سزا یافتہ مجرم ہیں" — اُس نے جواب دیا۔

"اور تم اِن سے مخبری بھی کراتے ہو؟"

"جی۔ کراتا ہوں۔"

اس کے بعد دونوں مصاحبوں کی باری باری شہادت ہوئی۔ اشفاق علی نے ان پر جرح کر کے کہلوا لیا کہ دونوں سزا یافتہ ہیں۔ ان کے جرائم کی تفصیل بھی ان سے معلوم کر لی۔ چونکہ ان کا تعلق جرائم اور پولیس کے ساتھ تھا اس لیے وہ جانتے تھے کہ وہ اپنا ریکارڈ چھپا نہیں سکتے۔ دونوں سے اشفاق علی نے ایک جیسے سوال پوچھے۔ دونوں نے کئی سوالوں کے جواب مختلف دیئے۔ ان دونوں میں ایک شکل و صورت، ڈیل ڈول اور لباس سے معزز آدمی لگتا تھا۔ اس کی سیاہ داڑھی سلیقے سے تراشی ہوئی تھی۔ اشفاق علی بتاتے ہیں کہ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ شخص جرائم پیشہ ہے۔ غالباً اسی وجہ سے پیر نے اسے اپنا مصاحبِ خاص بنایا تھا۔ یہ چونکہ زیادہ چالاک معلوم ہوتا تھا اس لیے اشفاق علی نے اس پر زیادہ جرح کی۔

"کیا اب بھی تمہارا پیشہ چوری چکاری ہے؟"

"نہیں جی" — اس نے جواب دیا — "میں توبہ تائب کر کے سرکار (پیر) کے آستانے میں گر پڑا ہوں۔"

"لیکن تم شراب نہیں چھوڑ سکے۔"

"اب تو اس کی بھی عادت نہیں رہی" — اس نے جواب دیا۔

"پہلے سے کم پیتے ہو؟"

"بہت کم۔"

"کیا پیر صاحب کو پلاتے پلاتے خود بھی پی لیتے ہو؟"

"مرشد کی شراب کچھ اور ہے، ہم گناہگاروں کی کچھ اور ہے" — اس نے جواب دیا — "وہ حق اللہ ہُو کی شراب ہے اور اس شراب کا نشہ صرف مرشد کے لیے جائز ہے۔"

"ظاہری طور پر وہ شراب بھی اُسی سکھ سے آتی ہے نا؟"

"ہوتی تو وہی ہے۔"

"جس رات پیر صاحب قتل ہوئے اُس رات وہ تمہیں کیا بتا کر نکلے تھے؟"

"کہتے تھے کہ محبوب کا بلاوا آیا ہے" — اُس نے جواب دیا۔

"اُس رات انہوں نے کتنی پی تھی؟"

"جتنی روز پیا کرتے تھے۔"

"تمہیں جب اطلاع ملی تھی کہ فلاں جگہ پیر کی لاش پڑی ہے تو تم نے اُس کی بیویوں کو اطلاع کیوں نہ دی؟" — اشفاق علی نے پوچھا — "خود ہی کیوں چلے آئے؟"

"میرے ہوش اُڑ گئے تھے" — اُس نے جواب دیا — "میں کچھ سوچ ہی نہ سکا۔"

"تم ملزم کو مارتے پیٹتے رہے ہو؟"

"نہیں۔"

"نمبردار نے بھی اپنی بھتیجی کا رشتہ پیر کو دینے سے انکار کر دیا تھا" — اشفاق علی نے کہا — "تم نے نمبردار کو کیوں نہیں مارا پیٹا؟"

"مجھے اس کا کوئی علم نہیں۔"

"تم اچھی طرح جانتے ہو کہ پیر کی چھوٹی بیوی کے نمبردار کے ساتھ تعلقات تھے" — اشفاق علی نے کہا — "اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ پیر کی چھوٹی بیوی سکینہ شریف لڑکی نہیں۔ وہ پیر کے پیچھے گھر سے نکل آئی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ پیر کی کوئی اور بیوی ہو۔"

"مجھے معلوم نہیں کہ وہ پیر صاحب کے پیچھے گھر سے نکل آئی تھی۔"

"مقتول پیر کی کرامات کیا تھی؟"

"بے اولاد عورتوں کو اولاد دیتے تھے" — اُس نے جواب دیا۔

"اور کیا وہ بے اولاد مردوں کو اولاد نہیں دیتا تھا؟"

"زیادہ تر عورتیں آیا کرتی تھیں" — اُس نے کہا۔

"کیا ناچنے گانے والیاں اور طوائفیں بھی اولاد کے لیے آیا کرتی

تھیں؟"

"نہ جی"۔ اُس نے جواب دیا۔"وہ دعا کرانے آتی تھیں کہ آمدنی زیادہ ہو۔"

"وہ اپنے سازندوں کے ساتھ دُعا کرانے آتی تھیں؟"

"جی"۔ اُس نے جواب دیا۔"وہ ناچ اور گانے سے پیر صاحب کو خوش کرتی تھیں۔"

"تمہیں اِس سے تو انکار نہیں کہ تم خود بدمعاش ہو"۔ اشفاق علی نے کہا۔"تم اچھی طرح جانتے ہو کہ بدمعاشی کے اڈوں پر ناچ گانا ہوتا ہے۔ جُوا کھیلا جاتا ہے۔ شراب چلتی ہے اور وہاں طوائفوں کو نئے گاہک ملتے ہیں۔ تم عدالت کو بتاؤ کہ کیا پیر صاحب کا آستانہ بدمعاشی کا اڈہ نہیں تھا کیونکہ وہاں یہ سب بُرے کام ہوتے تھے؟"

"میں اپنے پیر کے آستانے کی بے ادبی نہیں کر سکتا۔"

سیشن جج بول پڑا۔ اُس نے کہا۔"اگر تم اِن کے سوال کا جواب ٹھیک سے نہیں دو گے تو اس عدالت کی بے ادبی ہو گی جس کی تمہیں سزا ملے گی۔"

اشفاق علی نے اپنا سوال دُہرایا تو اُس نے کہا۔"وہاں ہوتا تو یہی کچھ تھا۔"

"کیا پیر کا اڈہ بدمعاشی کا اڈہ نہیں تھا؟"

سرکاری وکیل نے اعتراض کیا کہ گواہ سوال کا جواب دے چکا ہے۔ گواہ کی رائے نہیں لی جا سکتی۔ جج نے یہ اعتراض قبول کر لیا۔

اس کے بعد صفائی کے گواہوں کے بیان شروع ہوئے۔ سب سے پہلے تھانیدار کے خلاف جو انکوائری ہوئی تھی، اس کی مکمل فائل پولیس کے ضلع ہیڈ کوارٹر کے ایک سکّھ پولیس انسپکٹر نے پیش کی۔ یہ کورٹ کے حکم پر اور سمن پر منگوائی گئی تھی۔ سرکاری وکیل نے قانون کے کئی ایک حوالے دیئے اور کہا کہ یہ فائل ملزم کی صفائی میں کورٹ میں پیش نہیں کی جا سکتی لیکن اشفاق علی نے الہ آباد ہائی کورٹ کے دو فیصلوں اور لاہور ہائی کورٹ کے دو فیصلوں کے حوالے دے کر سرکاری وکیل کے حوالے بیکار کر دیئے۔ سیشن جج نے سرکاری وکیل سے کہا کہ وہ چاہے تو ہائی کورٹ میں درخواست دے سکتا ہے لیکن اُس نے دو ہائی کورٹوں کے دو دو فیصلوں کے حوالوں کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

اشفاق علی کی جرح پر ہیڈ کوارٹر کے سکھ انسپکٹر نے سب سے پہلے انکوائری کا فیصلہ پڑھ کر سُنایا۔ اس میں تھانیدار کے خلاف یہ جُرم ثابت ہو گیا تھا کہ اُس نے ملزم کی بیٹی کو تھانے بُلا کر اُس کے کپڑے اتروائے اور اسے اُس کے باپ کے سامنے کھڑا کر دیا اور اُس نے دو برہنہ کانسٹیبل بھی لڑکی کے ساتھ کھڑے کر دیئے۔ فیصلے کے مطابق تھانیدار کی ترقی عرصہ چھ سال کے لیے روک دی گئی تھی۔ وہ سب انسپکٹر سے انسپکٹر ہونے والا تھا۔ اُسے تھانے سے ہٹا کر ایک چوکی پر بھیج دیا گیا۔ اشفاق علی نے سکھ انسپکٹر سے پوچھا کہ وہ فائل دیکھ کر بتا سکتا ہے کہ اتنے سنگین جُرم کی سزا اتنی نرم کیوں دی گئی؟ — سکھ انسپکٹر نے فائل سے پڑھ کر سُنایا کہ تھانیدار کا ریکارڈ اچھا رہا ہے اور اُس نے دو بڑے ہی خطرناک ڈاکوؤں کے گروہ ختم کیے تھے۔ اس وجہ سے سزا تھوڑی دی گئی۔

انکوائری میں جو گواہ پیش ہوئے ان میں نمبردار بھی تھا۔ میں آپ کو نمبرداروں کے متعلق بتا دوں کہ یہ لوگ جرائم پیشہ لوگوں اور پولیس کے درمیان پُل کا کام بھی کرتے تھے۔ بڑے چالاک ہوتے تھے۔ تھانیداروں کی خوشامد بڑے ہی گھٹیا طریقے سے کیا کرتے تھے مگر پانی کا رُخ بھی دیکھ لیتے تھے۔ جب دیکھتے کہ کسی تھانیدار کے پاؤں تلے سے اُس کے بالائی افسر زمین نکال رہے ہیں تو نمبردار اپنی نمبرداری کی خاطر بالائی افسروں کا ساتھ دیا کرتے تھے۔ اس کیس میں اس نمبردار نے یہی رول ادا کیا تھا۔ اُس نے اپنی جان اور حیثیت کے تحفّظ کے لیے انکوائری میں بیان دیا کہ تھانیدار نے لڑکی کو تھانے بُلایا تھا۔ وہ بھی گیا تھا اور تھانیدار

نے ملزم سے اقبالی بیان لینے کے لیے یہ شرمناک حربہ استعمال کیا تھا جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔

انکوائری میں تھانے کے اے۔ ایس۔ آئی کے بیان کے علاوہ اُن دو کانسٹیبلوں کے بیان بھی تھے جنہیں لڑکی کے ساتھ برہنہ حالت میں کھڑا کیا گیا تھا۔ اُنہوں نے بیان میں کہا تھا کہ انہیں تھانیدار نے حکم دیا تھا۔

اشفاق علی نے انکوائری کی فائل کو ایسی قابلیت سے استعمال کیا کہ استغاثہ کی عمارت ڈولنے لگی۔ اس کے بعد اشفاق علی نے یہ اعلان کرکے کہ ملزم کا بیان لیا جاتے، میں صفائی میں کوئی گواہ پیش نہیں کروں گا، عدالت پر سناٹا طاری کر دیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ سیشن جج کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی جو میرے لیے حوصلہ افزا تھی۔

ملزم کو اشفاق علی نے جیل میں ملاقات کرکے بتا دیا تھا کہ وہ کیا بیان دے۔ ملزم نے جو بیان دیا وہ مختصراً یہ تھا کہ اُس نے اپنی بیٹی کی منگنی کسی جگہ کر دی تھی۔ اس سے آگے اُس نے وہی بیان دیا جو اُس کے اقبالی بیان میں آپ پڑھ چکے ہیں۔ آگے چل کر اُس نے کہا کہ اُس نے کوئی اقبالی بیان نہیں دیا۔ تھانیدار اُسے مار مار کر اور بڑی ہی سخت اور ناقابلِ برداشت اذیتیں دے دے کر مجبور کر رہا تھا کہ میں کورے کاغذ پر انگوٹھا لگا دوں۔ میں اَن پڑھ اور غریب آدمی ہوں جس کی زبان پر بھی دھن والوں کا قبضہ ہے لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ جہاں انگوٹھا لگ جاتے وہ بات پکّی ہو جاتی ہے۔ مجھ جیسا نادار اور محتاج آدمی کسی کو قتل کرنے کی جرأت کیسے کر سکتا ہے۔

اُس نے پوری تفصیل سے سُنایا کہ پیر، نمبردار اور پیر کے آدمیوں نے اُسے کتنی بار، کہاں کہاں اور کس طرح زدوکوب کیا۔ انہوں نے منگنی تُڑوا دی۔ آخر نمبردار اُس کی بیٹی کو تھانے لے گیا۔ اس موقع پر وہ عدالت کے کٹہرے میں اتنا رویا کہ اُسے اپنے اوپر قابو نہ رہا۔ سیشن جج نے سر جھکا لیا۔

کچھ دیر بعد ملزم نے سُنایا کہ تھانے میں اُس کی بیٹی کس حالت میں اس کے سامنے کھڑی کی گئی۔ تب اُسے خیال آیا کہ دُنیا کا قانون غریب کی عزت نہیں بچا سکتا۔ اُس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے اور تھانیدار سے فریاد کی کہ وہ اس کی بیٹی کو فوراً کپڑے پہنا دے اور جہاں چاہے انگوٹھے لگوا لے۔ اس طرح چار پانچ کورے کاغذوں پر اُس کے انگوٹھے لگوا لیے گئے۔ دس بارہ دنوں بعد اُسے جیل کی حوالات میں بھیج دیا گیا۔ جیل میں اس کے پاس پولیس کے دو افسر آئے۔ ان میں ایک انگریز تھا۔ انہوں نے پُوچھا کہ تھانے میں اگر واقعی اُس کی بیٹی کو بُلا کر بے پردہ کیا گیا تھا تو سارا واقعہ سُنا دے۔ اُس نے قتل کی کہانی شروع کر دی تو انگریز افسر نے اُسے کہا کہ اُسے قتل کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ تھانے میں اُس کی بیٹی کے ساتھ جو سلوک ہُوا ہے وہ بتائے۔ اُس نے سنا دیا اور افسر اس کے بیان پر انگوٹھا لگوا کر چلے گئے۔

اس کے بعد سرکاری وکیل نے اپنے دلائل پیش کیے اور زیادہ زور اقبالی بیان پر صرف کیا۔ اُس نے اپنا کیس قابلیت سے پیش کیا۔ کچھ اچھے حوالے بھی اُس نے دیئے مگر وہ زیادہ نہ بول سکا۔

اشفاق علی ساڑھے تین گھنٹے بولے۔ میں ان کے چیدہ چیدہ نکات پیش کرتا ہوں۔ اقبالی بیان کے متعلق انہوں نے کہا کہ تھانیدار کے خلاف محکمانہ انکوائری اور اس کے فیصلے نے اقبالی بیان کو بیکار کر دیا ہے۔ ملزم کہتا ہے کہ اس نے کسی مجسٹریٹ کے سامنے اقبالی بیان نہیں دیا۔ اگر ہم تسلیم کر لیں کہ اسے مجسٹریٹ کے سامنے لے جایا گیا اور اس نے اقبالی بیان لکھوایا ہے تو تھانیدار کے خلاف انکوائری کی رپورٹ اور سزا نے فاضل عدالت پر واضح کر دیا ہے کہ بیان کس طرح لیا گیا تھا۔ قانون اس طرح لیے ہوئے اقبالی بیان کو تسلیم نہیں کرتا۔

اگر ہم مجسٹریٹ کے بیان کو برائے بحث تسلیم کر لیں کہ ملزم کو اُس

کے سامنے لے جایا گیا تھا تو مجسٹریٹ کے اس بیان پر غور کریں کہ تھانیدار کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا جہاں وہ ملزم کو نظر آرہا تھا۔ جناب والا ملزم کی سوشل حیثیت دیکھیں۔ یہ غریب، نادار اور محتاج مزارع ہے۔ اَن پڑھ بلکہ گنوار ہے۔ اس کے لیے مجسٹریٹ اور تھانیدار فرعونوں سے کم نہیں۔ وہ یہی سمجھتا رہا کہ اس نے اقبالی بیان نہ لکھوایا تو تھانیدار اسے پھر پکڑ کر لے جائے گا اور اس کی بیٹی کو پھر برہنہ کر دے گا، لیکن یہ دلائل میں نے فاضل عدالت کی سہولت کے لیے دیئے ہیں تاکہ ہر پہلو سامنے آجائے۔ قانون کا تقاضا یہ ہے کہ اقبالی بیان کالعدم ہے۔ اپنے اس مؤقف کی حمایت میں اشفاق علی نے تین ہائی کورٹوں کے فیصلوں کے حوالے دیئے۔

اُنھوں نے کہا کہ مقدمے کی بُنیاد جھوٹ پر رکھی گئی ہے جھوٹ کی کڑیاں ملانا ناممکن ہوتا ہے۔ صرف رسّی کو لیجیے جس سے مبیّنہ طور پر مقتول کو قتل کیا گیا۔ تھانیدار نے کہا کہ رسّی لاش کے نیچے تھی جس آدمی نے لاش دیکھی تھی، اُس نے کہا کہ رسّی لاش سے دو تین قدم دُور دائیں طرف پڑی تھی اور نمبردار نے کہا کہ رسّی گلے میں تھی۔ نمایاں طور پر شک پیدا ہوتا ہے کہ رسّی خانہ پُری کے لیے شہادت میں استعمال کی گئی ہے۔ اس شک کا فائدہ ملزم کو ملنا چاہیئے۔

اشفاق علی نے کہا کہ تھانیدار نے ملزم کا بیان اپنے مطلب کے مطابق خود لکھا اور اس میں یہ بھی لکھا کہ قتل کے وقت ملزم کی بیٹی اس کے ساتھ تھی اور ملزم کو قتل سے روکتی رہی مگر اس لڑکی کو استغاثہ کے گواہ کے طور پر پیش نہیں کیا گیا۔ کیوں؟ — صرف اس لیے کہ لڑکی کے ساتھ تھانیدار نے جو سلوک کیا ہے اسے وہ بے نقاب کر دے گی۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ لڑکی کو کسی خاص مقصد کے تحت اس ڈرامے کا کردار بنایا گیا ہے۔

تھانیدار نے تو جھوٹ بولے ہی ہیں، نمبردار سب سے زیادہ جھوٹا گواہ تھا۔ انکوائری میں اس نے جو بیان دیئے وہ ریکارڈ پر آچکے ہیں

اور فاضل عدالت نے قبول کر لیے ہیں۔ عدالت میں اُس نے کہا کہ اُسے کچھ پتہ نہیں کہ لڑکی کو تھانے بلایا گیا تھا۔ انکوائری میں اُس نے کہا ہے کہ نہ صرف لڑکی کو تھانے بلایا گیا بلکہ وہ خود بھی تھانے گیا تھا۔ یہ آدمی اس ملزم کو بھی گرفتار کرانے اور اس سے اقبالی بیان لینے میں کوشاں رہا اور کامیاب ہُوا۔ اُس نے یہ جھوٹ بھی بولا کہ پیر شراب نہیں پیتا تھا۔ اس کے اپنے خاص آدمیوں نے کہا ہے کہ وہ شراب پیتا تھا قتل کی رات بھی وہ پیے ہوئے تھا۔ یہ انکشاف ڈاکٹر نے کیا ہے۔

اشفاق علی نے تمام گواہوں کے بیانات کا تجزیہ کیا اور اُن کی تضاد بیانی واضح کرتے چلے گئے۔ اُنھوں نے کہا کہ ہمارے سامنے سوال یہ نہیں کہ پیر کو کس نے قتل کیا، کیوں کیا اور کہاں کیا۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ یہ ملزم پیر کا قاتل ہے یا نہیں۔ میں نے گواہوں کے جو بیانات پیش کیے ہیں، ان سے شک نہیں بلکہ یقین ہوتا ہے کہ یہ ملزم بے گناہ ہے اور یہ ملزم ہمارے دیہاتی سسٹم کا شکار ہُوا ہے۔ میں نے پیر کے خاص آدمیوں سے کہلوایا ہے کہ پیر کا ڈیرہ بدمعاشی کا اڈہ تھا۔ ان پیروں کا گٹھ جوڑ نمبرداروں جاگیرداروں اور تھانیداروں کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ لوگ دیہاتیوں کے "خدا" بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ جناب والا! آپ نے نوٹ کیا ہوگا کہ میں نے ایک گواہ سے کہلوایا ہے کہ یہ پیر بے اولاد عورتوں کو اولاد دیتا تھا۔ بے اولاد خاوندوں کو نہیں، مگر عدالت کے کٹہرے میں دیہات کے "خدا" نہیں ایک بے گناہ آدمی کھڑا ہے جس کی قسمت کا آپ کو فیصلہ کرنا ہے۔

چار روز بعد سیشن جج نے ملزم کو بری کر دیا۔ فیصلہ بہت طویل تھا۔ فیصلے میں جج نے یہ بھی لکھا کہ تھانیدار کے خلاف صرف محکمانہ کارروائی کافی نہیں، اس کے خلاف باقاعدہ مقدمہ قائم کر کے عدالت میں پیش کیا جائے۔ پولیس قانون اور عوام کی محافظ ہوتی ہے مگر اس سب انسپکٹر نے قانون کی حفاظت کی نہ عوام کی۔

میں نے جب اس کیس کی فائل دیکھی تو مجھے بڑی دلچسپ لگی۔ مجھے جج

کا فیصلہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ ایک بے گناہ بری ہو گیا مگر عبدالقدیر نے بتایا کہ یہ ملزم بے گناہ نہیں تھا۔ پیر کو اسی نے قتل کیا تھا۔ اس کا اقبالِ جرم بالکل صحیح اور سچا تھا۔ اس میں اُس نے اپنی بیٹی کو بچا لیا تھا۔ ہُوا یوں تھا کہ اُس نے پیر کے گلے میں رسّی ڈالی اور تیزی سے رسّی کو مروڑ کر پھندا بنا لیا۔ پیر تنومند تھا۔ وہ پیچھے مُڑا۔ وہ ایک گھونسے سے اس فاقہ کش مزارع کو گرا دیتا مگر مزارع کی بیٹی نے بیٹھ کر پیر کے دونوں ٹخنے پکڑے اور اتنی زور سے جھٹکا دیا کہ پیر گر پڑا۔ مزارع نے رسّی کے پھندے کو تنگ کر کے اور جھٹکے دے دے کر پیر کو مار ڈالا۔ بیٹی گرے ہوئے پیر کی ٹانگوں پر کھڑی رہی تاکہ وہ آزاد نہ ہو سکے۔ وہ مر گیا تو دونوں نے اس کی لاش کھڈ میں لڑھکا دی۔

مزارع نے مقدمہ کی سماعت شروع ہونے سے پہلے اشفاق علی کو بتا دیا تھا کہ قتل اس نے اپنی بیٹی کی مدد سے کیا ہے اور اُس نے یہ قتل اپنی غیرت کی خاطر کیا ہے۔ اشفاق علی نے اسی لیے اُسے بری کرانے میں غیر معمولی محنت کی تھی اور اپنے ذرائع سے معلومات اکٹھی کی تھیں۔



خُدا کا دِل

میں ستّر سال عمر کے ایک بزرگ کی آپ بیتی انہی کی زبانی پیش کرتا ہوں۔ ان کا اصل نام لکھنا مناسب نہیں۔ دوسرے کرداروں کے نام بھی بدل کر پیش کر رہا ہوں۔ یہ بزرگ پنجاب اور آزاد کشمیر کی سرحد کے قریب ایک گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ دس بارہ سالوں سے اپنے گاؤں سے چند میل دُور ایک شہر میں اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ رہتے ہیں۔ اُن کے بیٹے کا پیشہ تجارت ہے۔ وہ میرا دوست ہے۔ اُس نے ایک بار مجھے اپنے والد صاحب کی جوانی کی کہانی سنائی تھی۔

اس بزرگ کی اپنی زبان سے ان کی آپ بیتی سننے کے لیے میں اُن کے پاس جا بیٹھا۔ وہ انسانوں سے محبّت کرنے والے اور خدا سے ڈرنے والے انسان ہیں۔ سچ بولتے ہیں اور جُھوٹ بولنے والوں کے سائے سے بھی نفرت کرتے ہیں مگر انہوں نے اپنی زبان سے کہا ”میں بدکھی تھا بدنام بھی تھا“ — تو میں اسے مذاق سمجھا۔ انہوں نے مجھے اپنی جوانی کی کہانی اِن الفاظ میں سُنائی:

میں سولہ سترہ سال کا تھا تو میرا باپ مر گیا۔ میں اُس کا اکیلا بیٹا تھا۔

زمین بے شمار تھی۔ دو بہنیں تھیں۔ دونوں کی شادی ہو چکی تھی۔ میرے دونوں بہنوئی اتنے اچھے تھے کہ میں نے اپنی بہنوں کو اُن کے حصّے کی زمین دی تو بہنوئیوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ اُن کی اپنی زمینیں بہت تھیں۔ بہنوئیوں کی موجودگی میں میں نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا کہ میرا کوئی بھائی نہیں۔ میں نے زمینیں بٹائی پر دے رکھی تھیں۔ خوشحالی اور بے فکری نے مجھے غلط راہ پر ڈال دیا۔ مجھے اس راہ پر ڈالنے

والی ہمارے ایک مزارعہ کی جوان بیوی تھی جسے پھولدار کپڑوں اور رنگا رنگ چوڑیوں کا بہت شوق تھا۔ میں نوجوان تھا۔ روکنے ٹوکنے والا کوئی تھا نہیں۔ نفع ونقصان اور اچھے بُرے کی تمیز نہیں تھی۔

ابھی میری شادی نہیں ہُوئی تھی لیکن میں بدی میں ڈوب چکا تھا۔ میں ہر عورت کو بُری نظر سے دیکھتا تھا۔ چونکہ میرے پاس پیسہ تھا اس لیے میری نیّت اور میری طرح کے اخلاق کی عورتیں مجھے اتنا خوبصورت جوان کہا کرتی تھیں جو انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ نہ سمجھنا کہ میرے گاؤں کی ہر عورت بدچلن تھی۔ میرا شکار عموماً غریب عورتیں ہُوا کرتی تھیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ بدچلنی صرف غریبوں کے حصے میں آئی ہے۔ اونچی ذات کے بعض گھرانے بھی ایسی عورتوں سے پاک نہیں تھے۔ میں چونکہ اس میدان کا کھلاڑی تھا اس لیے میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ بدچلنی میں ذات پات اور امیری غریبی کا کوئی دخل نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ روپے پیسے اور اونچی ذاتوں والے اپنے گناہوں پر پردہ ڈال لیا کرتے ہیں اور غریب جلدی ننگا ہو جاتا ہے یا ننگا کر دیا جاتا ہے۔

تم مجھ سے گناہ اور سزا کی بات پوچھ رہے ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں بالکل اَن پڑھ ہوں۔ اپنا نام بھی نہیں لکھ سکتا لیکن ستّر سالوں میں جو علم میں نے حاصل کیا ہے وہ تم ستّر کتابوں سے بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ اگر تم کتابوں کی بجائے انسانوں کو پڑھو تو عالم فاضل ہو جاؤ۔ تم دو بچوں کے باپ ہو لیکن میرے سامنے تم ایسے ہو جیسے تھوڑی دیر پہلے پیدا ہوئے ہو۔ تم شاید نہ مانو لیکن یہ سچ ہے کہ میں نے پیش اماموں کے گھروں میں بدی دیکھی ہے اور میں اُن پرہیزگاروں کے منہ سے بھی جھوٹ سُنا کرتا ہوں جو پنج وقتہ نمازی اور تہجّد گزار ہوتے ہیں۔ اگر کوئی مجھے یہ کہے کہ فلاں آدمی سچا ہے اور ثبوت یہ پیش کرے کہ وہ نماز روزے کا پابند ہے تو میں اس ثبوت کو نہیں مانوں گا۔ اس قماش کے انسان کی کھال اور کھوپڑی ایک ہوتی ہے لیکن ان کے اندر دو انسان ہوتے ہیں۔ ایک زاہد ہوتا ہے اور دوسرا گناہگار۔ ایک سچا ہوتا ہے دوسرا جھوٹا۔ اس ایک کھال میں ایک انسان خدا کی عبادت کرتا ہے اور دوسرا اپنی عبادت کرتا ہے۔ ایسے آدمی

مکار اور فریبی ہوتے ہیں۔ لوگ اُن کی پارسائی سے دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ میں نے سچے عبادت گزار بہت دیکھے ہیں۔ اُن کے گھروں میں روپوں کے گھڑے بھرے ہوتے ہوں تو بھی مسکینوں اور غریبوں کی طرح رہتے ہیں۔ اپنا آپ مار کر رکھتے ہیں۔ کسی کا دل نہیں دُکھاتے اور ہر کسی کے کام آتے ہیں اور ہر وقت خیال رکھتے ہیں کہ انہیں خدا کے پاس لَوٹ کے جانا ہے اور حساب دینا ہے۔

میں نے یہ باتیں اس لیے کی ہیں کہ تمہیں بتا سکوں کہ میں بدی کی دنیا میں رَچ بس گیا تھا اس لیے وہاں ایسے ایسے چہرے دیکھے ہیں لوگ جنہیں پاکیزہ اور پرہیزگار چہرے سمجھتے ہوں گے۔ میں اب تمہیں اپنی بات سناتا ہوں۔ میں سمجھ بیٹھا تھا کہ مرد کی زندگی یہی ہے کہ کسی نہ کسی عورت کے ساتھ تعلّقات پیدا کیے رکھے۔ ایسے کرتوت چُھپے نہیں رہتے۔ میری ماں اور بہنوں نے مجھے کہا کہ میں نے خاندان کا نام ڈبو دیا ہے۔ بہنوئیوں نے بھی مجھے بدی سے باز رہنے کو کئی بار کہا مگر میرا دماغ اتنا زیادہ خراب ہو چکا تھا کہ میں انہیں بیوقوف سمجھتا تھا۔

میں باز نہ آیا۔ عمر بیس سال ہونے کو تھی۔ میری شادی کر دی گئی کہ میں باز آ جاؤں گا۔ سب کا خیال غلط نکلا۔ بڑی اچھی شکل وصورت کی نوجوان بیوی مجھے بدی سے نہ نکال سکی۔ وہ گلے شکوے کرتی اور روتی تھی۔ میں ہنس کر ٹال دیا کرتا تھا۔ یہ میں اُس وقت کی بات کر رہا ہوں جب ہندو بھی ہمارے ساتھ رہا کرتے تھے۔ میں نے اُن کی بھی عورتوں کے ساتھ دوستانہ گانٹھ رکھا تھا۔

میری زندگی بدی میں ہی گزرتی رہی۔ جب ملک آزاد ہُوا اور ہم پاکستانی کہلانے لگے اُس وقت میرا یہ بیٹا بارہ تیرہ سال کا تھا۔ اس سے چھوٹی دس سال کی لڑکی تھی اور اس سے چھوٹا ایک لڑکا تھا جس کی اُس وقت عمر چھ سات سال تھی۔ ہمارا گاؤں کشمیر کی سرحد سے ملتا ہے اس لیے کشمیر کے کچھ مہاجرین ہمارے گاؤں میں آ گئے۔ ہندو اور دو گھرانے سکھوں کے جو ہمارے گاؤں میں آباد تھے، ہندوستان جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ ہمارے گاؤں والوں نے کوئی بدسلوکی نہ کی، بلکہ انہیں مدد دی کہ وہ جلدی گاؤں سے نکل جائیں۔ مدد دینے کی وجہ یہ تھی کہ بہت سے لوگ ہندوؤں کے مقروض تھے اور یہ قرض سُودی تھے۔ مقروض خوش

تھے کہ ہندو جا رہے ہیں۔ ایک تو قرض بخشے گئے دوسرے یہ کہ ہندوؤں کے مکان خالی رہ گئے۔ میں واحد آدمی تھا جس نے ہندوؤں کے ساتھ بدسلوکی کی تھی۔ وہ یہ کہ ان کی دو لڑکیوں پر میری نظر تھی لیکن وہ چال چلن کی بڑی پکّی تھیں۔ میں نے انہیں دھوکہ دے کر خراب کیا تھا اور انہیں تین دن ایک جگہ چُھپائے رکھا پھر آزاد کر دیا تھا۔

کشمیر سے چار پانچ مسلمان کنبے بڑی بُری حالت میں ہمارے گاؤں میں آئے۔ انہیں اب یہیں رہنا تھا۔ گاؤں کے بزرگوں نے انہیں ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے دو مکانوں میں لا کر آباد کر دیا۔ یہ دونوں کشادہ حویلیاں تھیں جن کے بہت سے کمرے تھے۔ گاؤں والوں نے انہیں کپڑے، بستر، برتن، چارپائیاں اور آٹا دیا۔ میں نے بہت کچھ دیا لیکن ان مہاجرین میں میری نظریں کچھ اور ڈھونڈ رہی تھیں۔

مجھے وہ چیز نظر آ گئی۔ وہ ایک خوبصورت کشمیری لڑکی تھی۔ اُس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ ان میں بارہ چودہ عورتیں تھیں لیکن یہ لڑکی میرے دماغ پر سوار ہو گئی۔ ایک روز وہ کھیتوں میں ساگ چُن رہی تھی۔ میں اُدھر سے گزرا اور اُس کے پاس رک گیا۔ اُسے کہا کہ اُسے جو کچھ بھی چاہیئے، میرے گھر سے لے لے۔ میں نے اُسے پیسے اور بڑے اچھے کپڑے دینے کا وعدہ کیا لیکن بُری نیّت کا اظہار نہ کیا۔ اُس نے دبی دبی اور اُداس سی آواز میں کہا —— "آپ نے ہم کو جگہ دی۔ بہت مہربانی اور کچھ نہیں چاہیئے" —— وہ پرے چلی گئی اور میں کچھ دیر وہیں کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔

میں نے اپنے دل میں یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ بیوی کو طلاق دے دوں گا اور اس لڑکی کے ساتھ شادی کروں گا۔ یہ فیصلہ یہ سوچ کر کیا تھا کہ یہ لوگ غریب، محتاج اور مجبور ہیں۔ دو تین سو روپے پر رشتہ دے دیں گے۔ ۱۹۴۸ء میں دو تین سو آج کے دو تین ہزار کے برابر ہوتے تھے۔ یہ ان لوگوں کے لیے بہت بڑی رقم تھی۔ ایک بار پھر میں کھیتوں میں اُس کے پاس جا کھڑا ہُوا اور کچھ باتیں کیں۔ وہ شرما کر چلی گئی۔

ڈیڑھ دو مہینے گزر چکے تھے۔ میں ان لوگوں کے پاس حویلی میں جایا کرتا اور

اُن سے پوچھا کرتا کہ انہیں کوئی چیز چاہیئے تو میرے گھر سے لے لیں۔ ایک روز میں صبح صبح گھر سے نکلا تو میرے دونوں بہنوئی اور میری برادری کے دو بزرگ آئے اور مجھے ڈیوڑھی میں لے جا کر بٹھا لیا۔ ایک بزرگ نے پہلی بات یہ کی —— "لڑکی واپس کر دو۔"

میں اُن کے منہ کی طرف دیکھنے لگا اور حیران ہو کر پوچھا —— "کونسی لڑکی؟"

"دیکھو بھائی!" —— میرے بڑے بہنوئی نے مجھے کہا —— "کہتے ہیں کہ چڑیل سات گھروں پر حملہ کرتی ہے لیکن ان میں سے ایک گھر کو بخش دیتی ہے.... تم وہ چڑیل ہو جس نے ساتویں گھر کو بھی نہیں بخشا۔"

میں بہت سٹپٹایا اور پوچھا کہ وہ کس لڑکی کی بات کر رہے ہیں۔ میرے پاس کوئی لڑکی نہیں ہے۔ انہوں نے یہ بتا کر مجھے اور زیادہ بے حال کر دیا کہ وہ کشمیری لڑکی جس پر میری نظر تھی، غائب ہو گئی ہے۔ میں نے قسمیں کھا کھا کر انہیں بتایا کہ یہ لڑکی میرے پاس نہیں اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ لاپتہ ہو گئی ہے۔

میرے بڑے بہنوئی نے کہا —— "تم قرآن مجید ہاتھ میں رکھ کر جھوٹ بولنے والے آدمی ہو۔ تمہاری عمر چالیس سال ہونے کو آئی ہے اور تم نے ابھی تک اپنی کرتوت نہیں چھوڑی۔ یہ ہماری غلطی تھی کہ کچھ عرصہ پہلے تمہیں جوتے مار مار کر سیدھا کرتے مگر ہم نے اس لیے ہاتھ روکے رکھا کہ اس میں اپنے ہی خاندان کی اور اپنی ہی ذات کی بے عزّتی ہو گی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تم نے اُس لڑکی کو اُڑا لیا ہے جو پاکستان کے نام پر اُجڑ کر آئی ہے اور اس کی عزّت کو بچانے کے لیے دو جوان آدمی ڈوگروں کے ہاتھوں شہید ہو گئے ہیں۔ ہم سب اونچی ذات کے لوگ ہیں اور یہ کشمیری روٹی کے ایک ایک لقمے کے محتاج ہیں لیکن تم جیسے بے غیرت اور جھوٹے آدمی نہیں جانتے کہ ہم سب ان بھوکے اور بے گھر کشمیریوں کی جوتیوں کی خاک کی بھی برابری نہیں کر سکتے۔"

میرا پسینہ نکل آیا۔ یہ بالکل صحیح تھا کہ میں جھوٹ بولا کرتا تھا اور میں جھوٹی قسمیں کھایا کرتا تھا اور یہ تو میں بتا چکا ہوں کہ میں بڑا ہی بدانسان تھا لیکن اس لڑکی کی گمشدگی کے ساتھ میرا دُور پار کا بھی تعلق نہیں تھا مگر میری سچی قسموں کو بھی

وہ جھوٹ کہہ رہے تھے۔ انہوں نے یہ ثبوت پیش کیا کہ مجھے اس لڑکی کے ساتھ کھیتوں میں باتیں کرتے دیکھا گیا تھا اور میں اس لڑکی کی خاطر ان کی حویلی میں جایا کرتا تھا۔ انہوں نے سب سے بڑا ثبوت تو یہ پیش کیا کہ میں اسی قماش کا آدمی ہوں اور میں نے ہندوؤں کی دو لڑکیوں کو چھپائے رکھا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ میں نے اس کشمیری لڑکی کو بھی کہیں چھپا رکھا ہے۔ مجھے دھمکی دی گئی کہ میں نے لڑکی واپس نہ کی تو میرے ساتھ دشمنوں جیسا سلوک کیا جائے گا۔

ہُوا یوں تھا کہ لڑکی شام کے بعد لاپتہ ہوئی۔ رات کو اُس کی ماں اور دو چچے اُسے ڈھونڈتے رہے۔ علی الصبح انہوں نے گاؤں والوں کو بتایا کہ اُن کی لڑکی لاپتہ ہوگئی ہے۔ لڑکی کا باپ زندہ نہیں تھا۔ میرے بزرگوں نے میرے بہنوئیوں کے ساتھ بات کی اور سب نے اسی پر اتفاق کر لیا کہ لڑکی کو میں نے ہی اغوا کیا ہے۔

اُنہوں نے جب میری قسموں پر اعتبار نہ کیا تو مجھے غصہ آگیا۔ میں نے انہیں کہا کہ میں لڑکی کو کہانہیں گیا۔ خود ڈھونڈ لیں۔ میرے گھر کی اور کھیتوں والے کوٹھے کی تلاشی لے لیں۔ میں یہ کہہ کر اُٹھ کھڑا ہُوا اور اندر چلا گیا۔ اندر جا کے دیکھا میری دونوں بہنیں آئی بیٹھی تھیں۔ انہوں نے اور میری بیوی نے مجھے گھیر لیا اور یہی الزام عائد کر کے کہ میں نے کشمیری لڑکی کو اغوا کر کے کہیں چھپا رکھا ہے، مجھے بڑی سخت باتیں کہیں۔

"آپ اُسے گھر لے آئیں، میں اپنے ماں باپ کے پاس چلی جاتی ہوں" — میری بیوی نے کہا — "اگر آپ کی شرم اور غیرت مر گئی ہے تو اپنی معصوم بیٹی کو دیکھیں۔ ذرا سوچیں کہ آپ مر گئے ہیں اور اسے کوئی اُٹھا لے گیا ہے۔ میں سترہ اٹھارہ سالوں سے آپ کی بدکاری دیکھ رہی ہوں۔ آپ کو شرم نہیں آتی۔ میں شرم سے اب باہر نہیں نکلتی۔ آدھے گاؤں کو پتہ چل چکا ہے کہ کشمیری پناہ گزینوں کی لڑکی لاپتہ ہوگئی ہے اور ہر کسی کا شک آپ پر ہے۔"

میرا دماغ پھر گیا۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ میں گاؤں میں بدنام ہوں اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ میری مالی حیثیت اور اونچی ذات کی وجہ سے کوئی مجھے روک ٹوک نہیں سکتا مگر مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ مجھے اس قدر مجرم سمجھا جائے گا کہ میں نے جو جُرم نہیں کیا وہ بھی میرے ہی کھاتے میں ڈالا جائے گا۔ مجھے بہت زیادہ غصہ آنا چاہیے تھا اور چاہیئے یہ تھا کہ میں سب کے مقابلے میں کھڑا ہو جاتا مگر ہُوا یہ کہ میرا غصہ موم کی طرح پگھل گیا اور مجھے رونا آگیا۔ خون اُبلنے لگا۔

میں نے اپنی بہنوں اور اپنی بیوی کو کوئی جواب نہ دیا۔ میں باہر نکل گیا۔ دروازے کے سامنے میرے دونوں بہنوئی اور بزرگ کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے بلایا لیکن میں نہ رُکا۔ میں اُس حویلی میں چلا گیا جہاں گمشدہ لڑکی کا کُنبہ رہتا تھا۔ اُس کی ماں رو رہی تھی۔ مرد پریشان اور اُداس بیٹھے تھے۔ مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ میرا دماغ روشن ہوگیا ہے۔ میں نے لڑکی کی ماں سے پوچھا کہ لڑکی کس طرح غائب ہوئی ہے؟ کیا وہ کہیں باہر گئی ہوئی تھی؟

اُس نے بتایا کہ وہ ہر جمعرات کی شام ساتھ والی خانقاہ پر دیا جلانے جایا کرتی تھی۔ گذشتہ شام بھی وہیں گئی تھی پھر واپس نہیں آئی۔ یہ لوگ اپنے وطن سے جلا وطن ہوگئے تھے اور ان کی قتل و غارت بھی بہت ہوئی تھی۔ اب وہ خانقاہوں پر دیئے جلا کر اپنی قسمت بدلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مجھے کچھ یاد آگیا۔ ہمارے گاؤں سے اڑھائی تین میل دُور ایک گاؤں کا ایک خوشحال زمیندار جو مجھ سے چار یا پانچ سال چھوٹا تھا۔ تین چار بار کشمیری مہاجرین کے لیے آٹا اور کپڑے وغیرہ لایا تھا۔ میری اُس کے ساتھ گہری سلام دعا تھی۔ مجھے اُس پر شک ہُوا۔

میں نے لڑکی کی ماں سے پوچھا کہ کیا وہ آدمی آٹا اور کپڑے سب کو دیتا تھا یا صرف لڑکی کی ماں کو؟ اُس نے وہ بات بھی بتا دی جو میں نے نہیں پوچھی تھی۔ اُس نے بتایا کہ وہ اپنی بیٹی کے ساتھ خانقاہ پر سلام کرنے گئی تھی۔ یہ آدمی انہیں وہاں ملا اور ماں بیٹی سے کہا کہ وہ اُس کے گھر چل کر رہیں۔ اپنے مردوں کو بھی لے آئیں۔ انہیں سب کچھ ملے گا۔ دودھ والے مویشی بھی دے دیئے جائیں گے۔ ماں نے اُسے کہا کہ وہ اپنے مردوں سے پوچھ کر بتائے گی۔ دوسرے دن وہ اُن کے ہاں آگیا۔ پھر آتا رہا اور ایک روز اُس نے لڑکی کی ماں سے کہا کہ وہ لڑکی کا بیاہ اُس کے ساتھ کر دے۔ ماں نہ مانی۔ لڑکی کے چچوں نے بھی انکار کر دیا اور کہا کہ وہ مصیبت

کے مارے لوگ اتنے اونچے گھر کے قابل نہیں۔ دراصل یہ لوگ اس شادی کو دھوکہ سمجھ رہے تھے۔ انہیں احساس تھا کہ لڑکی بہت خوبصورت ہے۔ اس کے دو روز بعد لڑکی لاپتہ ہو گئی۔

میں نے لڑکی کی ماں اور اُس کے چچوں کو تسلّی دی اور کہا کہ میں اُن کی بیٹی کو لے آؤں گا۔ میں اپنے گھر آیا۔ کسی کے ساتھ کوئی بات نہ کی۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں نے خاموشی سے گھوڑی پر زین کسی۔ کلہاڑی ہاتھ میں لی اور گھوڑی پر سوار ہو کر چل پڑا۔ میری بہنوں نے اور میری بیوی نے مجھے آوازیں دیں۔ وہ میرے تیور سے شاید ڈر گئی تھیں۔ میرے بہنوئی میرے پیچھے دوڑے لیکن میں نے گھوڑی کو ایڑ لگائی اور گاؤں سے نکل گیا۔

میں نے جس آدمی کا ذکر کیا ہے اُس کے گاؤں جا پہنچا۔ وہ مجھے گھر میں مل گیا۔ میں نے اُسے شریفانہ طریقے سے کہا کہ لڑکی واپس کر دو۔ وہ ہنس پڑا اور اُس نے میرے ساتھ ہنسی مذاق شروع کر دیا۔ میں نے اُسے صاف بتا دیا کہ گاؤں والے مجھ پر شک کر رہے ہیں اور میں اپنی جان کی قربانی دے کر بھی لڑکی کو ڈھونڈ کر گاؤں میں کھڑا کروں گا۔ میری اتنی ساری باتیں سُن کر وہ سنجیدہ ہُوا اور کہنے لگا کہ واقعی اُس نے لڑکی کا رشتہ مانگا تھا اور لڑکی کی ماں اور چچوں نے انکار کر دیا تھا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ وہ اتنا پتھر دل نہیں کہ لُٹ پٹ کر آنے والے پناہ گزینوں کی لڑکی کو اغوا کرلے۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے کہا کہ پھر یہی ہُوا ہے کہ لڑکی اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ نکل گئی ہے۔

"نہیں" — اُس نے کہا — "لڑکی بہت شریف ہے اور اتنی سیدھی سادی اور قسمت کی ماری ہوئی ہے کہ وہ کسی کے ساتھ بھاگ جانے کی سوچ ہی نہیں سکتی" — اُس نے پھر ماتھا سکیڑ لیا اور ذرا دیر بعد کہنے لگا — "مجھے ایک اور آدمی پر شک ہے۔ تم اُسے جانتے ہو"

اُس نے ڈیڑھ میل دُور کے ایک گاؤں کا اور وہاں کے ایک جوان آدمی کا نام لے کر کہا — "وہ میرا دوست ہے۔ تم شاید جانتے ہو گے کہ وہ تمہاری طرح

بگڑا ہُوا شہزادہ ہے۔ اُس نے بھی اس کشمیری لڑکی کو دیکھا تھا۔ میں نے اُسے بتایا تھا کہ میں اس لڑکی کے ساتھ شادی کر لوں گا۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ اس لڑکی کو اُٹھا لے جائے گا۔ میں اسے مذاق سمجھا تھا لیکن اب یاد آتا ہے کہ اُس نے کچھ ایسی باتیں کی تھیں جن پر میں نے اُس وقت دھیان نہیں دیا تھا۔ اب یقین سا ہو رہا ہے کہ وہ ہاتھ دکھا گیا ہے"

"میں اُس کے پاس جاؤں؟" — میں نے پوچھا۔

"میں کچھ نہیں کہوں گا" — اُس نے کہا — "وہ سخت اکھڑ طبیعت کا آدمی ہے۔ کہیں تمہارے گلے نہ پڑ جائے"

میں اُسے جانتا تھا۔ میری طرح وہ بھی باپ کے مرنے کے بعد بہت سی زمین کا مالک بن گیا تھا۔ عیّاش اور لٹھ باز تھا۔ میرے خون کا اُبال میری برداشت سے باہر ہو چکا تھا۔ سیدھا طریقہ یہ تھا کہ اُس کے تھانے میں رپورٹ درج کرائی جاتی اور پولیس خود ہی لڑکی برآمد کر لیتی لیکن دیہات کا رواج کچھ اور تھا۔ تھانے والوں کی مدد لینے والے کو بزدل سمجھا جاتا تھا۔ میں بھی ایسی بزدلی نہیں دکھانا چاہتا تھا۔

میں اس آدمی کے گاؤں کو چل پڑا۔ گھوڑی نے جلدی پہنچا دیا۔ وہ اپنے باغیچے میں ملا۔ بڑا خوبصورت باغیچہ تھا۔ سبزیوں کے علاوہ پھلوں کے کچھ درخت تھے اور پھولدار پودے بھی تھے۔ وہاں اُس نے چھوٹا سا مکان بھی بنا رکھا تھا۔ اس مکان میں شراب بھی چلتی تھی اور کبھی کبھی نامی گرامی جواری اکٹھے ہوتے اور بازی لگتی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ تپاک سے ملا اور مجھ سے پوچھا کہ کدھر جا رہے ہو۔ میں نے اُسے بتایا کہ تمہارے پاس آیا ہوں۔ اُس نے کہا، حکم کرو، کیا خدمت کروں؟ میں نے کہا — "یار! وہ لڑکی دے دو"

"کونسی لڑکی؟"

"مذاق نہ کرو یار!" — میں نے ہنستے ہوئے کہا — "وہ بے چارے مظلوم لوگ ہیں۔ ان کی لڑکی تم لے آئے ہو"

اُس نے کہا — "وہ تمہاری کیا لگتی ہے؟ .... دیکھو راجے! تم میرے ہم ذات

ہو۔ میرے گھر آئے ہو۔ میرا فرض ہے تمہاری عزّت کروں ۔ عزّت سے رخصت ہو جاؤ۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ لڑکی تمہارے پاس ہے"۔۔۔ میں نے سنجیدہ ہو کر کہا ۔۔۔ "اگر ہے تو میرے حوالے کر دو۔"

"اگر مگر کو چھوڑو"۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "جاؤ تھانیدار کو لے آؤ۔"

مجھے معلوم تھا کہ اُس نے تھانیدار کو لانے کے لیے کیوں کہا ہے۔ تھانیدار اُس کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اُسے آرام سے کہا ۔۔۔ "تھانے کمزور آدمی جایا کرتے ہیں۔ لڑکی میرے گاؤں سے اُٹھائی گئی ہے ۔ وہ میری عزّت ہے۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ تھانے نہیں جاؤں گا۔ لڑکی تم سے لوں گا۔"

"راجے!"۔۔۔ اُس نے میری ران پر ہاتھ مار کر کہا ۔۔۔ "لڑکی میرے پاس ہے۔ ہمّت ہے تو لے جاؤ۔"

میں اُٹھ کھڑا ہُوا اور یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ میں لڑکی کو زبردستی نہیں لے جاؤں گا، اُسے کہا ۔۔۔ "مجھے کیا مصیبت پڑی ہے کہ پرائی لڑکی کی خاطر اپنے ہم ذات کے ساتھ دشمنی مول لوں؟ میں تو یہ کہنے آیا تھا کہ اس غریب کی بد دُعا نہ لو۔"

"بیٹھو۔ بیٹھو"۔۔۔ اُس نے میرا بدلا ہُوا لہجہ دیکھ کر کہا ۔۔۔ "یار! تم تو دھونس جما رہے تھے ۔ لعنت بھیجو۔ تمہیں کیا پڑی ہے ۔ یہ لوگ بھوکے ننگے ہیں ۔ کل جا کر اس کی ماں کو دو چار سو روپیہ دے آؤں گا۔"

"یہ اچھا ہے"۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "اُن سے فیصلہ کر لو۔"

اُس نے مجھے کھانے کے لیے روک لیا۔ دیہات میں جو خاطر تواضع ہو سکتی تھی وہ اُس نے کی اور میں محبّت اور پیار سے رخصت ہُوا۔ گاؤں میں آکر میں نے کسی کے ساتھ کوئی بات نہ کی۔ میں اتنا خاموش کبھی نہیں ہُوا تھا۔ بہنوں، بیوی اور بہنوئیوں نے پھر مجھے گھیر لیا۔ میں نے انہیں اتنا ہی کہا کہ لڑکی میرے پاس نہیں ہے لیکن مِل جائے گی۔ اُن کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں ابھی تک یہی شک ہے کہ لڑکی کو میں نے کہیں چھُپا رکھا ہے۔

ہمارے گاؤں میں ایک نائی ہُوا کرتا تھا۔ اُس وقت جوان تھا۔ خوبرو

تھا اور اُس کی زبان میں جادو تھا۔ در پردہ پولیس کا مخبر تھا اور پیدائشی جاسوس تھا۔ وہ میرا خاص آدمی تھا۔ میں نے اُسے اس آدمی کا نام بتا کر کہا کہ اُس کے گاؤں جا کر معلوم کرو کہ اُس نے لڑکی کو کہاں رکھا ہُوا ہے۔

وہ اُسی وقت چلا گیا اور سورج غروب ہوتے ہی خبر لے آیا کہ لڑکی اُس کے باغیچے میں ہے۔ میں گاؤں کے ایک آدمی سے ملا۔ وہ ہر کام کر گزرنے والا دلیر آدمی تھا۔ میرا دوست اور ہمراز تھا۔ میں نے اُسے ساری بات سنائی اور کہا کہ میں لڑکی کو گاؤں میں لا کر اپنے چہرے سے تہمت مٹانا چاہتا ہوں ۔ وہ میرا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گیا ۔۔۔ تم شاید یقین نہ کرو۔ آج کل نہ وہ دلیری رہی ہے نہ دوست دوست کی خاطر قربانی کرتے ہیں۔ غیرت بھی کم ہو گئی ہے ۔۔۔۔ میں نے اپنے اس دوست کو بتایا کہ لڑکی کو کس طرح لانا ہے۔

ہم دونوں آدھی رات کے وقت گھوڑیوں پر گاؤں سے نکلے ہم دونوں کے پاس کلہاڑیاں تھیں اور میرے پاس ٹارچ بھی تھی ۔ ہم اُس شہزادے کے گاؤں میں نہ گئے ۔ کھیتوں میں سے ہوتے باغیچے تک گئے اور گھوڑیاں ایک درخت کے ساتھ باندھ کر باغیچے کے اندر چلے گئے ۔ کسی کی آواز آئی ۔۔۔ "کون ہے اوتے؟"

میں سمجھ گیا کہ یہ پہرہ ہے۔ میں نے آگے بڑھتے ہوتے کہا ۔۔۔ "بھائی! ہمیں راستے پر ڈال دو۔ کشمیر سے آ رہے ہیں۔"

اُن دنوں کشمیر کی جنگ ہو رہی تھی۔ لوگ اِدھر اُدھر آتے جاتے رہتے تھے۔ پہرہ دار ہمارے قریب آ گیا۔ چاندنی بڑی صاف تھی۔ وہ جونہی قریب آیا میں نے اُسے ہچّنی دے کر گرا دیا۔ پاؤں اُس کی شہ رگ پر رکھ کر کلہاڑی اُس کے منہ کے ساتھ لگا دی اور کہا ۔۔۔ "اگر اونچی آواز نکالی تو کھوپڑی کھول دوں گا ۔۔۔ لڑکی کہاں ہے؟"

اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا ۔۔۔ "اس مکان میں ہے۔"

"وہاں کون کون ہے؟"

"بس لڑکی ہے اور وہ اکیلا ہے"۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "شراب پی کر مست پڑا ہے۔ برآمدے میں دو پلنگ بچھے ہوتے ہیں۔"

"یہیں بیٹھے رہنا" — میں نے کہا — "ہمارا ایک آدمی تمہیں دیکھتا رہے گا۔ مارے جاؤ گے۔"

وہ غریب آدمی دبک کے بیٹھ گیا۔ میں اپنے دوست کے ساتھ مکان تک گیا۔ صحن کی دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ ہم دونوں نے پگڑیاں چہروں پر لپیٹ لیں۔ دوست نے مجھے نیچے سے سہارا دیا اور میں دیوار پر جا کر اندر اُتر گیا۔ دروازے کی زنجیر کھول دی۔ دوست بھی اندر آ گیا۔ صحن چند گزوں کا تھا۔ ہم دبے پاؤں آگے بڑھے۔ برآمدے میں دو پلنگ ملے ہوئے بچھے تھے۔ میں نے ٹارچ جلائی۔ کشمیری لڑکی سوئی ہوئی تھی اور وہ آدمی خراٹے لے رہا تھا۔

میں نے لڑکی کا سر ہلایا۔ وہ ہڑبڑا کر جاگی۔ میں نے دھیمی آواز میں اُسے کہا — "اٹھو۔ اپنے گاؤں چلو۔"

وہ گھبراہٹ میں کچھ نہ کچھ بولنے لگی۔ رو بھی رہی تھی۔ ان آوازوں پر اُس آدمی کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا — "کیا ہے۔ لیٹی رہ"۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ شراب کا نشہ اُترا نہیں۔ میرے دوست نے کلہاڑی اُس کے سامنے کر کے کہا — "چُپ کر کے لیٹے رہو۔ ہلے بولے تو سر کھول دوں گا۔"

میں نے اُسے کہا — "دیکھ لے راجے! لڑکی تھانیدار کے بغیر جا رہی ہے۔"

اُس کے سر پر کلہاڑی رکھی ہوئی تھی۔ وہ نشے میں بھی تھا۔ اُس نے کہا — "اب نہیں تو کل سہی۔ جا، دیکھ لوں گا۔"

لڑکی ڈر رہی تھی کہ ہم اُسے اُسی نیت سے اُٹھا کے لے جا رہے ہیں جس نیت سے یہ آدمی اُسے لایا تھا۔ وہ بے چاری میرے پاؤں میں گر پڑی اور فریادیں کرنے لگی کہ میں اُس پر رحم کروں۔ وہ جب کہتی کہ ہم پر ڈوگروں نے بہت ظلم کیا ہے، تم مسلمان مجھ پر رحم کرو تو دل میں کانٹا سا چُبھتا تھا۔ میں اور میرا دوست اُسے زبردستی باہر لائے۔ باہر لا کر میں نے اُسے اپنے کندھے پر ڈال لیا۔ دروازے کی باہر کی زنجیر چڑھا دی اور ہم اپنی گھوڑیوں تک پہنچے۔ لڑکی رو رہی تھی اور آزاد ہونے کو تڑپ رہی تھی۔

میں نے اُسے گھوڑی پر اپنے آگے بٹھایا اور ایک بازو اُس کے گرد لپیٹ کر اسے قابو کر لیا۔ وہ ابھی تک تڑپ رہی تھی۔ اُسے اس ڈر سے پیچھے نہیں بٹھایا تھا کہ وہ گھوڑی سے کُود جائے گی۔ ہم چل پڑے۔ باغیچے سے اس آدمی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ اپنے پہرے دار کو گالیاں دے رہا تھا۔ آواز بتا رہی تھی کہ وہ نشے سے بے حال ہے۔ ہم نے تھوڑی دُور تک گھوڑیاں دوڑائیں۔ گاؤں دور رہ گیا تو گھوڑیوں کی رفتار کم کر لی۔

میں نے چہرے سے صافہ ہٹا کر لڑکی کو بتایا کہ میں کون ہوں۔ اس سے اُس کی کچھ ڈھارس بندھی لیکن وہ مجھے شریف آدمی نہیں سمجھتی تھی۔ وہ بھول نہیں سکتی تھی کہ میں نے کھیتوں میں اور اُس کے گھر میں بھی بُری نیّت کا اظہار کیا تھا لیکن میرے اندر جو تبدیلی آگئی تھی اسے وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ کیا جانتی، میں خود نہ سمجھ سکا کہ میرے اندر کیا ہو رہا ہے۔ تم ذرا سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں عورتوں کا شکاری تھا اور جس لڑکی کو میں نے بازو کے گھیرے میں لے کر اپنے ساتھ لگا رکھا تھا، اُس کی خاطر میں نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کی بھی سوچ لی تھی۔ تم نہیں سمجھ سکتے کہ وہ کتنی خوبصورت تھی۔

وہ اب میرے ساتھ لگی ہوئی میرے قبضے میں تھی لیکن میں ایسے محسوس کر رہا تھا جیسے کسی نے مجھے ایک بڑی ہی پاک امانت دے دی ہے جس میں خیانت ہوئی تو مجھ پر بجلی گرے گی یا میں زمین میں زندہ دھنس جاؤں گا۔ یہ ایک خوف تھا لیکن اس خوف سے مجھے ایسی خوشی اور ایسا اطمینان حاصل ہو رہا تھا جو میں نے بدی اور عیاشی میں نہیں پایا تھا۔ اِس خوشی اور اس اطمینان نے مجھے دلیر بنا دیا تھا۔ میرا سینہ پھیل گیا تھا اور میں نے اپنے دوست سے فخر سے کہا — "میں سارے گاؤں کو اکٹھا کر کے اس لڑکی کو اس کی ماں کی گود میں ڈالوں گا۔"

میں نے لڑکی سے پوچھا کہ وہ اِس آدمی کے ہاتھ کیسے لگ گئی تھی۔ اُسے مجھ پر اعتبار آ گیا تھا۔ اُس نے بتانا شروع کر دیا۔ وہ کشمیری لہجے میں اُردو بولتی تھی اور بعض لفظ اپنی زبان کے کہہ جاتی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے معصوم سا بچّہ توتلی زبان میں بول رہا ہو۔ اُس نے پہلے تو یہ سُنایا کہ اپنے گاؤں میں ڈوگروں نے اُن کے ساتھ کیسا ظلم کیا تھا۔ ان کافروں نے مقبوضہ کشمیر کے دیہات سے جوان عورتوں کو

اپنے قبضے میں لے لیا اور جوان آدمیوں اور بچوں کو قتل کر دیا اور اُن کے گھروں کو آگ لگا دی۔

اس لڑکی کے گاؤں والے وقت سے پہلے نکل آئے۔ میں اُس کے گاؤں کا نام بھول گیا ہوں۔ راستے میں ان پر ڈوگروں نے حملہ کیا۔ مردوں نے مقابلہ کیا۔ عورتوں نے ڈوگروں کو پتھر مارے۔ یہ لڑکی دو ڈوگروں کے ہاتھ آ گئی تھی۔ اسے چھڑانے کے لیے دو جوان آدمی شہید ہو گئے۔ ڈوگروں کی تعداد کم تھی اس لیے وہ مارے گئے اور بعض زخمی ہو کر بھاگ گئے لیکن ان کشمیری مسلمانوں کا بھی جانی نقصان ہُوا۔ وہ خوف دہراس سے مرتے، گرتے پڑتے پا پیادہ وادیوں میں چُھپ چُھپ کر چلتے رہے۔ موسم برفباری کا تھا۔ یہ لوگ برف کے عادی تھے، پھر بھی ایسی مشکلات میں چلتے آئے کہ سنو تو دل کانپ جائے۔

یہ نہتّہ قافلہ ہمارے گاؤں میں آ گیا۔ ان کی کامیابی یہ تھی کہ اپنی جانیں اور اپنی عورتوں کی عزت بچا لائے تھے۔ یہاں آئے تو ان کی عزت پر مجھ جیسے شکرے ٹوٹ پڑے۔ لڑکی نے مجھے بتایا کہ اس گاؤں میں آ کر اُس کے دل پر خوف چھا گیا۔ اُس کی ماں اسی لیے پریشان رہتی تھی۔ گاؤں کی عورتوں سے انہوں نے سُنا کہ گاؤں سے تھوڑی دُور جو خانقاہ ہے اس میں بڑی طاقت ہے اور وہاں دیا جلانے والے مصیبتوں سے بچے رہتے ہیں اور ان کی ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ ایک شام لڑکی اپنی ماں کے ساتھ خانقاہ پر سلام کے لیے گئی اور اس کے بعد ہر جمعرات کی شام لڑکی کبھی اکیلی اور کبھی ایک دو لڑکیوں کے ساتھ جاتی رہی۔

جس شام وہ لاپتہ ہوئی، وہ اکیلی خانقاہ پر گئی تھی۔ وہاں اسے ایک ملنگ ملا جس نے اسے خانقاہ کی کرامات سُنانی شروع کر دیں۔ لڑکی نے مجھے بتایا کہ وہ ملنگ سے بہت متأثر ہوئی۔ ملنگ نے اُسے کہا کہ اس خانقاہ سے پرے ایک پرانی قبر ہے جس میں ایک عورت دفن ہے۔ خانقاہ میں جو بزرگ دفن ہیں وہ اس عورت کو بہت پسند کرتے تھے اور اس عورت نے ان کی بہت خدمت کی ہے۔ ملنگ نے لڑکی سے کہا کہ اُس نے یہ بھید کسی کو نہیں بتایا کہ جو عورت اس عورت کی قبر پر جا کر جو بھی مُراد مانگے وہ پُوری ہو جاتی ہے۔

لڑکی بے بسی، مظلومیت اور کسمپرسی کی حالت میں تھی۔ وہ ملنگ کی باتوں کے جادو میں آ گئی اور اُس کے ساتھ اُس عورت کی قبر کی طرف چل پڑی۔ میں جانتا ہوں کہ وہاں کوئی پُرانی قبر نہیں۔ وہاں زمین نشیب میں چلی جاتی ہے اور وہاں درختوں کے جُھنڈ ہُوا کرتے تھے۔ وہ ویرانہ تھا۔ لڑکی نے یہ بھی نہ دیکھا کہ شام گہری ہو چکی ہے۔ ملنگ نے ذرا پیچھے ہو کر لڑکی کے سر پر ایک کپڑا پھینکا جس میں اُس کا چہرہ چُھپ گیا۔ ملنگ نے بڑی تیزی سے کپڑے کو گانٹھ دے دی۔ لڑکی کی آواز نہ نکل سکی۔ ملنگ نے لڑکی کو اٹھا لیا۔ لڑکی نے ایک اور آدمی کی آواز سُنی۔ اِسے باری باری دو آدمیوں نے کندھوں پر لاش کی طرح ڈال کر اٹھایا۔

بہت دُور جا کر وہ رُک گئے اور لڑکی کے سر سے کپڑا کھول دیا۔ اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ چاند ابھی نہیں نکلا تھا۔ اُس ملنگ نے لڑکی کو دھمکایا کہ وہ چُپ کر کے چلی چلے ورنہ اُسے خراب کر کے قتل کر دیا جائے گا۔ وہ بہت روئی اور اُن کے پاؤں پر بھی گری مگر انہوں نے اِسے ڈرا ڈرا کر چلنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اُسے

ایک گاؤں سے باہر باہر باغیچے میں لے گئے۔ وہ آدمی جس سے ہم لڑکی کو چھین لائے تھے وہیں تھا۔ ملنگوں نے نعرہ لگا کر اُسے کہا کہ مال آ گیا ہے۔

اس آدمی نے ملنگوں کو شراب پلائی اور کچھ پیسے بھی دیئے۔ اُس نے لڑکی سے کہا کہ وہ بالکل نہ ڈرے۔ اسے وہ شہزادی بنا کر رکھے گا اور اُس پر کوئی ظلم نہیں ہو گا۔ ملنگ چلے گئے تو اس آدمی نے لڑکی کے آگے بہت سے پیسے رکھ دیئے اور پیار سے باتیں کیں لیکن لڑکی روتی رہی اور اُس کے آگے ہاتھ جوڑتی رہی۔ اُس نے اس آدمی کو یہ بھی سُنایا کہ وہ ڈوگروں کا بہت ظلم سہہ کر اور پاکستان کو اپنا گھر سمجھ کر آئے ہیں مگر اس آدمی پر کچھ اثر نہ ہُوا۔

اُس نے لڑکی کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا پھر اُسے زبردستی شراب پلائی۔ جس عصمت کی حفاظت میں دو جوان آدمی شہید ہو گئے تھے وہ ایک شرابی مسلمان کی بھینٹ چڑھ گئی۔ لڑکی دن کو اسی مکان میں قید رہی۔ اگلی رات اُس شہزادے نے اُسے پھر شادی اور شہزادیوں جیسی زندگی کے جھانسے دیئے مگر لڑکی روتی تھی اور اب اُسے کوستی اور بددعائیں بھی دیتی تھی۔ ہم جب باغیچے کے اس

مکان میں پہنچے اور لڑکی کو جگایا، اس سے تھوڑی ہی دیر پہلے اس شرابی نے لڑکی کو سونے کی اجازت دی تھی۔

ہم لڑکی کے ساتھ اپنے گاؤں پہنچ گئے۔ میں نے سب سے پہلے ان بزرگوں میں سے ایک کے دروازے پر دستک دی جو میرے بہنوئیوں کے ساتھ مجھ سے لڑکی واپس لینے آئے تھے۔ وہ آنکھیں ملتا باہر آیا تو میں لڑکی کو گھوڑی سے اُتار چکا تھا۔ لڑکی کو وہیں چھوڑ کر دوسرے بزرگ کو اور پھر اپنے دونوں بہنوئیوں کو جگا لایا۔ سب ایک بزرگ کی ڈیوڑھی میں بیٹھ گئے۔ میں نے لڑکی سے کہا کہ انہیں بتاؤ کہ میں تمہیں کہاں سے لایا ہوں۔ میرا دوست بھی ساتھ ہی تھا۔ لڑکی نے سب کو بتایا کہ اُس کے ساتھ کیا بیتی ہے۔

میں نے انہیں بتایا کہ میں نے کس طرح لڑکی کا سراغ لگایا اور کس طرح اس دوست کی مدد سے اسے لایا ہوں۔ اتنے میں صبح طلوع ہونے لگی۔ لڑکی کو اُس کے گھر چھوڑ آئے اور ہماری برادری میں اس مسئلے پر بحث ہونے لگی کہ اُس آدمی کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ تھانے رپورٹ دینے پر کوئی بھی راضی نہ ہُوا۔ وہ آدمی چونکہ ہماری ذات کا اور حیثیت والا آدمی تھا اس لیے یہ فیصلہ ہُوا کہ لڑکی مل گئی ہے اس لیے بات یہیں پر گول کر دی جائے اور اس آدمی کو اُس کے گاؤں میں رُسوا نہ کیا جائے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے گاؤں والوں سے کہتا کہ ہم اُس پر جھوٹا الزام تھوپ رہے ہیں۔ اُس نے لڑکی اپنے گاؤں والوں سے بھی چُھپا کے رکھی ہو گی۔

ہم سب خاموش رہے۔ اس واقعہ کو ہم نے ہضم کر لیا۔ میری بہنیں اور میری بیوی مجھ سے شرمسار تھیں لیکن میں نے انہیں کچھ بھی نہ کہا۔ اپنی عادت کے مطابق طبیعت کو خوش رکھا۔

اُسی رات کا ذکر ہے۔ آدھی رات کے لگ بھگ میری بیوی نے مجھے جگایا۔ وہ اپنی چارپائی پر جو میری چارپائی کے ساتھ ملی ہوئی تھی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اٹھی نہیں تھی۔ اُس نے سرگوشی کی ـــــ "اونچی نہ بولنا .... لیٹے رہو۔ سامنے دیکھو۔"

راتیں سرد ہو جاتی تھیں اس لیے ہم برآمدے میں سوئے ہوئے تھے۔ ہمارا مکان پکا تھا۔ میرے ساتھ بیوی کی چارپائی اور دائیں طرف میرے لڑکے کی

چارپائی تھی جس کی عمر بارہ تیرہ سال ہو چکی تھی اور میری بیوی کے ساتھ میری لڑکی اور اس کے چھوٹے بھائی کی چارپائیاں تھیں۔ صحن میں ایک بیری کا اور ایک شہتوت کا درخت تھا۔ صحن کے دائیں بائیں کمرے تھے اور سامنے دیوار اور بڑا دروازہ۔ درختوں میں سے مجھے دائیں طرف منڈیر پر ایک آدمی نظر آیا۔ چاندنی بڑی صاف تھی۔ برآمدے میں اندھیرا تھا۔

ایک کی بجائے تین آدمی ہو گئے۔ میری بیوی کی آنکھ اتفاقیہ کھُلی تھی۔ وہ تینوں منڈیر سے غائب ہو گئے۔ وہ سیڑھیوں کی طرف چلے گئے۔ میں نے دوڑ کر کلہاڑی اٹھالی اور میری بیوی نے ایک ڈنڈا اُٹھالیا جو دو اِنچ سے زیادہ موٹا تھا۔ ہم دونوں دبے پاؤں دوڑ کر کھُرلی کی اوٹ میں جا بیٹھے۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ آدمی کس طرح ہمارے کوٹھے پر چڑھے ہیں۔ میرے مکان کے ساتھ ملا ہُوا ایک کچّا مکان گرا ہُوا تھا اور خالی پڑا تھا۔ اس کھنڈر اور اس کے ملبے سے آسانی سے میرے کوٹھے پر چڑھا جا سکتا تھا۔

وہ تینوں سیڑھیوں سے اُتر آئے اور آہستہ آہستہ برآمدے کی طرف بڑھنے لگے۔ تینوں کے پاس کلہاڑیاں تھیں اور تینوں کے سر اور مُنہ صافوں میں چھُپے ہوئے تھے۔ وہ جب کھُرلی کے قریب سے گزرے تو میں اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اس کھُرلی پر صرف گھوڑی بندھی تھی۔ گھوڑی ہنہنائی تو اُن تینوں نے پیچھے دیکھا۔ میں نے کلہاڑی کا وار کیا مگر وہ آدمی تیزی سے پرے ہٹ گیا۔ میں انہیں ڈاکو سمجھ رہا تھا۔

میری بیوی بھی سامنے آ چکی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا۔ مجھے اس کا ڈر تھا کہ عورت ذات ہے' ماری جائے گی لیکن میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ اُس نے مردوں کا مقابلہ کس طرح کیا۔ وہ تین تھے اور ہم دو۔ نہ میں نے گاؤں والوں کو جگانے کے لیے شور مچایا نہ میری بیوی نے۔ کلہاڑیاں ٹکرا رہی تھیں۔ میری نظر اپنی بیوی پر بھی تھی۔ میں نے اُسے کلہاڑی کے وار سے بچتے اور ڈنڈے کے وار کرتے بھی دیکھا۔ اُس کی للکار بار بار سنائی دیتی تھی ـــ "پاؤں پر قائم رہنا .... میری فکر نہ کرنا .... ان میں سے ایک بھی زندہ نہیں جائے گا۔"

مجھے کندھے پر کلہاڑی لگی مگر گہری نہ لگی۔ میں نے ایک آدمی کو گرا لیا۔ ایک آدمی

کا صافہ سر سے گر پڑا۔ اس میں اُس کی کلہاڑی اُلجھ گئی۔ میری بیوی نے اُس کے سر پر ڈنڈا مارا۔ وہ گر رہا تھا تو بیوی نے ایک اور ڈنڈا مارا۔ وہ اب اُٹھ نہیں سکتا تھا۔ ایک کو میں نے گرا لیا اور تیسرے نے کلہاڑی پھینک دی اور بیٹھ کر اُس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ اُن کے ہارنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ چور تھے اور اُنہیں بھاگنا بھی تھا۔ چور اور ڈاکو کی یہی کمزوری ہوتی ہے۔ وہ لڑتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف جانے کی کوشش کر رہے تھے۔

میری بیوی نے لالٹین جلائی۔ تب میں نے دیکھا کہ اُس کے کپڑے خون سے لال تھے اور یہی حال میرا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں دیکھا، جس کے سر پر ڈنڈے پڑے تھے وہ وہی عیّاش شہزادہ تھا جس سے میں لڑکی چھین کے لایا تھا۔ اس کا ساتھی میری کلہاڑی سے زخمی ہُوا تھا۔ اس کے سر میں زخم آئے تھے اور ایک زخم بازو پر تھا۔ وہ ہوش میں آ گیا تھا۔ تیسرے کو کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔ ان دونوں ساتھیوں کو وہ اُجرت پر ساتھ لایا تھا۔

میں نے اپنے لڑکے کو جگایا اور اُسے کہا کہ وہ گھبرائے نہیں، ہم نے چور پکڑے ہیں۔ اس سے پوچھ لینا۔ یہ تمہارا دوست ہے۔ بچپن سے دلیر ہے۔ میں نے اسے اپنے بہنوئیوں کو جگا لانے کو کہا۔ وہ دوڑا گیا۔ وہ آئے تو انہوں نے ساری برادری کو جگا لیا۔ شہزادے کے زخمی اور دوسرے ساتھی نے بتایا کہ وہ مجھے قتل کرنے اور میری بچی کو اغوا کرنے آئے تھے۔ یہ اُس کی انتقامی کارروائی تھی۔

گاؤں میں ایک جرّاح تھا۔ اُسے بلایا۔ اُس نے اُسی وقت ہم سب کی مرہم پٹی شروع کر دی۔ میری بیوی کے زخم گہرے نہیں تھے۔ چار زخم تھے۔ اب پھر یہ مسئلہ سامنے آ گیا کہ تھانے رپورٹ کی جائے یا کیا کیا جائے۔ ہمارے بزرگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ بدبخت آدمی ہمارا ہم ذات اور بڑا زمیندار ہے۔ اس کے بزرگوں کو یہاں لایا جائے۔ اگر وہ ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لیں تو تھانے رپورٹ نہ کی جائے۔

اُسی وقت دو آدمی گھوڑیوں پر اُس کے گاؤں بھیج دیئے گئے۔ ان کے ساتھ اس آدمی کے دو ماموں، ایک چچا اور برادری کے دو بزرگ آ گئے۔ انہوں نے جب میرے گھر کا منظر دیکھا تو پریشان ہو گئے۔ ہمارے بزرگ اُن پر برس پڑے اور انہیں

کہا کہ وہ پولیس کو لانے جا رہے ہیں۔ انہیں بتایا گیا کہ پرسوں اس شخص نے ایک کشمیری لڑکی اغوا کی تھی جسے میں لے آیا اور آج یہ انتقام لینے آ گیا۔

اُس کے بزرگوں نے کہا کہ یہ پکا بدمعاش اور شرابی ہو چکا ہے۔ اگر اسے سزا ہو گئی تو ساری برادری اور ذات کی بے عزتی ہے۔ انہوں نے قسمیں کھا کر وعدہ کیا کہ آئندہ اسے ایسی حرکت نہیں کرنے دیں گے۔ اُس کے دونوں ساتھیوں کے متعلق انہوں نے کہا کہ اس کی وجہ سے انہیں بھی پولیس کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے ساتھ جو سلوک کرنا چاہو، اپنے پاس رکھ کر کر لو۔

وہ سب اُسے گھوڑی پر ڈال کر لے گئے اور اُس کے ساتھیوں کو ہمارے حوالے کر گئے۔ وہ ہماری ذات کے آدمی نہیں تھے۔ اس آدمی کے کرائے کے جرائم پیشہ ساتھی تھے۔ اُن میں جو زخمی تھا اُس کے زخموں کی مرہم پٹی ہو چکی تو ہم نے ان دونوں کے ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھ دیئے اور دونوں کے گلوں میں رسیاں ڈال کر باہر ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا۔ انہیں ہم نے دس دن اپنے پاس رکھا اور ان کے ساتھ ہم نے جو سلوک کیا وہ میں نہیں بتاؤں گا۔ میرے بیٹے کو یاد ہو گا۔ اس سے سُن لینا۔ گاؤں کے بچوں کے لیے وہ دو بندر تھے۔ رات کو ہم انہیں اتنی تکلیفیں دیتے تھے جو پولیس بھی نہ دیتی ہو گی۔ وہ ہمارے آگے زمین پر ماتھے اور ناک رگڑتے تھے۔ دسویں گیارہویں روز اُن کے مُنہ کالے کر کے انہیں گاؤں سے نکال دیا۔

اصل بات جو میں تمہیں سُنانا چاہتا ہوں وہ اس عیّاش شہزادے کی ہے۔ وہ اپنے آپ کو خوبصورت اور نڈر جوان سمجھتا تھا۔ وہ قانون سے بھی نہیں ڈرتا تھا۔ وہ بھول گیا تھا کہ دنیا میں ایک قانون اور بھی چلتا ہے جس سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ یہ شخص واقعی خوبصورت جوان تھا۔ وہ سمجھ بیٹھا تھا کہ انسانوں کی قسمت اور زندگی اُس کے ہاتھ میں ہے۔ وہ مجھے قتل کرنے آیا تھا مگر ایک عورت کے ڈنڈے نے اُسے بے ہوش کر دیا۔

میرا خیال تھا کہ وہ ٹھیک ہو چکا ہو گا مگر پندرھویں سولہویں روز اُس کے گاؤں کے ایک آدمی نے بتایا کہ وہ پاگلوں جیسی حرکتیں کرتا ہے۔ اُس کے سر میں جو ضربیں لگی تھیں وہ ٹھیک ہو گئیں مگر ان ضربوں نے اُس کا دماغ بیکار کر دیا

تھا۔ اُس کے متعلق خبریں ملتی رہیں۔ پتہ چلا کہ وہ کبھی تو قہقہے لگانے لگتا ہے اور کبھی گیدڑوں کی طرح چیخنے چلّانے لگتا ہے۔ کبھی خاموش بیٹھا ہوتا ہے اور اچانک باہر کو دوڑ پڑتا ہے۔ ایک روز اُس نے ایک خارش زدہ کتّے کو پکڑ لیا اور کتوں کی طرح اُسے کاٹنے لگا۔ بڑی مشکل سے اُسے گھسیٹ کر گھر لے گئے۔

اُسے لاہور بھی لے گئے تھے لیکن اُس کا علاج نہ ہو سکا۔ اُسے پیروں فقیروں کے پاس بھی لے جاتے رہے مگر اُس کی حالت بگڑتی گئی۔ چھ سات ماہ بعد اُس کی یہ حالت ہو گئی کہ اُس کی داڑھی سکھوں کی طرح بہت بڑھ گئی۔ سر کے بال بڑھ کر کندھوں پر آ گئے۔ اُس کے کپڑے میل اور بدبو سے بھر گئے۔ وہ نہاتا نہیں تھا نہ نائی کو قریب آنے دیتا تھا۔ ایک روز اُسے مویشیوں کا گوبر کھاتے دیکھا گیا — اور ایک روز اطلاع ملی کہ وہ مر گیا ہے۔ اِس کے فوراً بعد یہ بات سُنی گئی کہ اُسے اُس کے ایک ماموں نے زہر دے کر مارا تھا۔ ایسی زندگی سے تو موت ہی بہتر تھی۔ میں نے اُسے اس حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ کہتے تھے کہ اُس کے کپڑوں پر، داڑھی اور سر میں موٹی موٹی جوئیں پھرتی نظر آتی تھیں اور دُور سے اُس کے جسم سے بدبُو آتی تھی۔

اس چند ماہ کے عرصے میں میری اپنی حالت بڑی خراب رہی۔ میرے اور میری بیوی کے زخم ٹھیک ہو گئے لیکن مجھے ایسے لگتا تھا جیسے میرے دل میں زخم ہو گیا ہے۔ مجھے اپنی بُری عادتوں سے نفرت ہو گئی۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا لیکن مجھ میں پچھتاوا پیدا ہو گیا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آتی تھی کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ بار بار دل میں آتی تھی کہ اس کشمیری لڑکی کے پاؤں پڑ کر اُس سے معافی مانگوں کہ میں نے اُسے بُری نظر سے دیکھا تھا مگر ہمت نہیں پڑتی تھی۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ میرے گھر میں آئی۔ دونوں میری احسان مند تھیں لیکن میں اُن سے شرمسار تھا۔

میں پیروں فقیروں کے پاس گیا اور ہر ایک کو یہی ساری کہانی سُنا کر پوچھا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی مجھے نہ بتا سکا۔ ایک بار مجھے اس شہر میں زمین کے ایک ٹکڑے کے انتقال کے لیے آنا پڑا تو یہاں کی جامع مسجد کے خطیب کی تعریف سُنی۔ میں اپنے کام سے فارغ ہو کر اُن کے پاس چلا گیا۔ انہیں یہ کہانی سُنائی اور پوچھا کہ میں پریشان اور بے چین کیوں ہوں۔

اُن کے الفاظ آج تک یاد ہیں۔ اُنہوں نے کہا — "تمہیں خدا نے اِس نیکی کا اجر دیا ہے کہ دشمن تمہیں قتل کرنے آیا اور تمہاری بیوی کی آنکھ کھُل گئی۔ پھر خدا نے تمہیں یہ نعمت دی کہ تمہارے دل میں گناہ کی نفرت پیدا کر دی۔ تم ابھی تک اپنے آپ کو گناہگار سمجھ رہے ہو۔ تم نے گناہ کا اقبال کر لیا ہے۔ جاؤ، خدا کے حضور شکرانہ ادا کرو۔ نیکی کرو۔ سچ بولو۔ یہ بے چینی جو تم محسوس کر رہے ہو، یہ تمہاری اور شیطان کی لڑائی ہے۔ تم یہ لڑائی بھی جیت لوگے۔ ہار نہ جانا۔ پچھلے گناہوں کو بھول جاؤ۔ اب جتنی نیکیاں کرو گے اتنے ہی پچھلے گناہ دُھلتے جائیں گے۔ خدا کو دل میں رکھو۔ خدا تمہیں اپنے دل میں رکھے گا۔ صرف یہ خیال رکھنا کہ جھوٹ نہ بولنا اور کسی پر جھوٹا بہتان نہ باندھنا۔ ہر دن کو اپنی زندگی کا آخری دن سمجھنا۔"

اس کے بعد وہ آدمی پاگل ہو کر مرا یا مارا گیا۔ اُس وقت تک خدا نے مجھے اپنے دل میں رکھ لیا تھا — اور خدا کے دل میں رہتے ہوئے مجھے تیس سال گزر گئے ہیں۔



کہانی ایک بیٹے کی

یہ واقعہ مجھے ایک دوست نے سنایا تھا جو ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ ریٹائر ہو چکا تھا۔ اڑھائی سال گذرے فوت ہو گیا ہے۔ یہ قصّہ بہت پُرانا ہے لیکن اولاد دینے والے پیر موجود ہیں اور ان کا جادو اُسی زمانے کی طرح چل رہا ہے جس زمانے کا میں واقعہ سنا رہا ہوں۔ میں اِس ہیڈ کانسٹیبل کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ ہمارے گاؤں الگ الگ تھے۔ یہ واقعہ تو میں نے اُسی وقت سُن لیا تھا جب یہ ہُوا تھا لیکن صحیح حالات ہیڈ کانسٹیبل نے سنائے تھے۔ میں وہ جگہ نہیں بتاؤں گا اور ان لوگوں کے نام بھی نہیں بتاؤں گا۔

یہ قصّہ ایک عامل شاہ کا ہے جسے میں عامل شاہ ہی کہوں گا۔ اس کا شہرہ دُور دُور پہنچا ہُوا تھا۔ بے اولاد عورتوں کو اولاد دیتا تھا۔ کہیں چوری ہو جائے تو چور کا نام، پتہ اور حلیہ بتا دیتا تھا۔ کسی کی لڑکی گھر سے بھاگ جائے یا اغوا ہو جائے تو بتاتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ اس کے قبضے میں جن تھے جو اُسے یہ سارے راز بتایا کرتے تھے۔ یہ تو اُس کی کرامات تھی جو لوگ ایسی عقیدت اور یقین سے سنتے اور سناتے تھے جیسے مسجد میں مولوی آیات اور احادیث سناتا ہے اور لوگ عقیدت سے سنتے ہیں۔

ہیڈ کانسٹیبل نے جو اُس وقت عامل شاہ کے علاقے کے تھانے میں ہُوا کرتا تھا، مجھے بتایا کہ چوری کے بہت کم واقعات ایسے ہیں جن کے عامل شاہ نے چور پکڑوائے ہوں گے۔ اُس کے پاس ایسے مخبر تھے جو اُسے بتایا کرتے تھے کہ چور فلاں شخص ہو سکتا ہے۔ بہرحال اس پہلو کو الگ رکھ دیں کہ اُس کی کرامات

کی حقیقت کیا تھی۔

عامل شاہ کی عمر پچاس سال سے اوپر ہو چکی تھی لیکن اچھی غذا اور بے فکری کی وجہ سے وہ تیس سال کا جوان لگتا تھا۔ اُس کے گال سُرخ تھے۔ جسم پر چربی تھی اور وہ بدمست بھینسا لگتا تھا۔ شراب بھی پیتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو پیر تو نہیں کہتا تھا لیکن پیروں کی طرح اُس کے مرید تھے اور اُس کے طور طریقے پیروں جیسے تھے۔ عورتیں اُس کی زیادہ معتقد تھیں۔ اُس کی دو بیویاں تھیں۔ ایک کی عمر چوبیس پچیس سال تھی۔ اُس کی اپنی عمر پچاس سال کے اوپر تھی۔ پہلی بیوی سے اُس کی ایک بیٹی تھی جس کی عمر سترہ اٹھارہ سال تھی۔ ابھی اُس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔

عامل شاہ کا مکان گاؤں سے تقریباً تین فرلانگ دُور بالکل الگ تھلگ اور اکیلا تھا۔ اِس کے ساتھ اُس نے ایک باغ سبزیوں کا بنا رکھا تھا جس میں رہٹ تھا۔

ایک روز صبح سویرے گاؤں والوں نے دیکھا کہ ایک چارپائی پر کسی کو ڈالے ہوئے اور چار آدمی چارپائی اٹھائے دوڑے جا رہے تھے۔ چار پانچ آدمی ساتھ تھے اور عامل شاہ گھوڑے پر سوار ساتھ ساتھ چلا جا رہا تھا۔ معلوم ہُوا کہ عامل شاہ کی نوجوان بیٹی صبح سویرے اپنے باغ کے باہر بے ہوش حالت میں برہنہ پائی گئی۔ گھر والوں کو رات کے پچھلے پہر پتہ چلا تھا کہ لڑکی گھر میں نہیں ہے۔ تلاش کرتے کرتے صبح ہوگئی اور وہ باغ کے باہر اونچی فصل میں بیہوش پڑی ہوئی ملی۔ اس کے ساتھ درندوں جیسا سلوک کیا گیا تھا۔ اُسے ہسپتال لے جا رہے تھے جو وہاں سے تین ساڑھے تین میل دُور تھا۔

عامل شاہ نے پردہ ڈالنے کی بہت کوشش کی لیکن ہسپتال میں گیا ہُوا کیس کیسے چھپ سکتا ہے۔ لڑکی ہوش میں آتی تھی تو چیخیں مار کر پھر بے ہوش ہو جاتی تھی۔ شاہ کے مرید ہسپتال جا کر بیمار پُرسی کرنے لگے۔ عامل شاہ نے یہ مشہور کیا کہ دو خود سر اور باغی جنّوں نے اُس کی بیٹی کو اُٹھا کر باہر پھینک دیا تھا اور وہ ڈر گئی ہے۔ عامل شاہ کہتا تھا کہ وہ ان جنّوں کو سب کے

سامنے جلائے گا۔

ہسپتال کا ڈاکٹر ہندو تھا۔ ہسپتال کے دوسرے ملازم بھی تھے۔ ان سب نے لوگوں کو حقیقت کی بات بتا دی۔ لڑکی صرف یہ بتاتی تھی کہ تین آدمی تھے۔ وہ اُسے باغ میں سے اٹھا کر لے گئے تھے۔

پندرہ سولہ دنوں بعد لڑکی ٹھیک ہوئی اور اُسے گھر لے آئے۔ عامل شاہ نے پولیس کو رپورٹ نہ دی۔ لوگوں نے مان لیا کہ لڑکی پر جنّوں نے حملہ کیا تھا۔ اس سے عامل شاہ کی دھاک بیٹھ گئی کہ جنّوں کی دنیا کے ساتھ اس کا گہرا تعلق ہے لیکن لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ عامل شاہ اب غصّے میں رہنے لگا تھا۔

دس بارہ دن گذرے تو عامل شاہ کی گھوڑی مر گئی۔ دیہات میں انسانوں اور حیوانوں کے ڈاکٹر نہیں ہُوا کرتے تھے۔ "سیانے" بہت تھے۔ حیوانوں کی بیماریاں تو لوگ خود سمجھ لیتے اور علاج کر لیتے تھے، عامل شاہ کی مری ہوئی گھوڑی جنہوں نے دیکھی وہ کہتے تھے کہ اُسے سانپ نے ڈسا ہے یا اسے زہر دیا گیا ہے۔

دو تین روز بعد آدھی رات کو گاؤں کے لوگوں نے چیخیں سنیں۔ سوئے ہوئے لوگ جاگ اُٹھے اور چھتوں پر جا کے دیکھا۔ عامل شاہ کے باغ میں آگ کے شعلے اُٹھ رہے تھے اور کوئی چیخ رہا تھا۔ لوگ لاٹھیاں کلہاڑیاں وغیرہ لے کر دوڑے گئے۔ چیخیں ختم ہوگئیں۔ وہاں عامل شاہ اور اُس کے دو خاص مرید کھڑے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ عامل شاہ نے دونوں جنّوں کو حاضر کر کے جلا دیا ہے اور یہ جن چیخ رہے تھے۔ جنّوں نے اقبالِ جرم کر لیا تھا کہ گھوڑی بھی انہوں نے ہی ماری تھی۔

بیس بائیس دنوں بعد گاؤں کی ایک عورت کی لاش اس حالت میں دیکھی گئی کہ کھیتوں میں ایک درخت کے ساتھ اپنے سر کے بالوں سے بندھی ہوئی تھی۔ وہ جوان عورت تھی اور چال چلن کی بدنام تھی۔ بہت مکّار اور عیّار عورت تھی لیکن اتنی ہنس مکھ اور ملنسار تھی کہ ہر کوئی اُسے پسند کرتا تھا۔ یہ خاص طور پر ذہن میں رکھیں کہ یہ عورت عامل شاہ کی خاص مریدنی تھی اور عورتوں میں عامل شاہ کا پروپگنڈہ کرتی رہتی تھی۔ مجھ جیسے لوگ بہت کم تھے جو عامل شاہ

کو نہیں مانتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ عورت عامل شاہ کی پسند کی عورتوں کو اُس کے جال میں لے جاتی تھی۔

آپ اخباروں میں اس قسم کی خبریں پڑھتے ہوں گے کہ فلاں جگہ کسی نے کسی کو چھری ماردی اور علاقے میں خوف وہراس پھیل گیا۔ یہ محض الفاظ ہوتے ہیں۔ اصل خوف وہراس تو وہ تھا جو عامل شاہ کے علاقے میں پھیلا تھا۔ یکے بعد دیگرے تین وارداتیں ہوگئیں۔ عامل شاہ نے اپنی بیٹی اور گھوڑی والی وارداتوں کے متعلق لوگوں سے منوالیا تھا کہ یہ جنّوں نے کی ہیں۔ اُس نے مجرم جنّوں کو جلا بھی ڈالا تھا۔ اب اس عورت کی لاش اس حالت میں ملی جس طرح میں نے بتایا ہے تو لوگوں پر صحیح معنوں میں خوف وہراس طاری ہوگیا۔ بعض ایسے آدمیوں نے بھی نمازیں پڑھنی شروع کر دیں جن کے متعلق خیال تھا کہ انہیں نماز آتی ہی نہیں۔

عامل شاہ نے اپنی بیٹی اور گھوڑی کے کیس پولیس کو نہ دیئے کیونکہ ان کی وجہ سے اُس نے جنّوں کے ساتھ اپنا تعلق پکا کر لیا تھا لیکن اس عورت کے قتل پر پولیس آگئی۔ تھانیدار سکھ تھا۔ اُس نے کئی آدمیوں کو مشتبہ بٹھا لیا اور جس طرح پولیس تفتیش کرتی ہے اُس نے بھی شروع کر دی۔ عامل شاہ کو بھی شاملِ تفتیش کیا گیا مگر کچھ پتہ نہ چلا کہ قاتل کون ہے اور قتل کی وجہ کیا ہے۔ لوگ اس رائے پر متفق تھے کہ مقتولہ نے کسی کی بیٹی کو کسی کے لیے ورغلایا ہوگا۔ لڑکی نے گھر بتا دیا ہوگا اور لڑکی کے بھائیوں وغیرہ نے اس عورت کو ننگا کر کے اس کا گلا گھونٹ دیا اور لاش بالوں سے درخت کے ساتھ لٹکا دی۔

تھانیدار بھی اسی شک پر تفتیش کر رہا تھا۔ اُسے جس پر بھی شک ہوا اس نے اُسے تھانے بلا کر مارا پیٹا۔ عورت کمزور گھرانے کی تھی۔ تفتیش کا کچھ بھی نہ بنا۔

ڈیڑھ دو مہینے گذر گئے تھے۔ ایک صبح شور مچ گیا کہ عامل شاہ کے گھر میں نقب لگی ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ نقب پچھواڑے کی دیوار میں زمین کے قریب سے اتنی خاموشی سے لگائی جاتی تھی کہ گھر والوں کو خبر تک نہ ہوتی تھی۔

عامل شاہ کا گھر اینٹوں کا تھا۔ نقب لگانے والے ایک اوزار سے ایک اینٹ نکالتے تھے تو باقی اینٹیں آسانی سے نکل آتی تھیں۔ اُس وقت سیمنٹ کی بجائے مٹی کا گارا استعمال ہوتا تھا۔ دیوار میں اتنا سا شگاف کیا جاتا تھا جس میں ایک آدمی بیٹھ کر یا لیٹ کر اندر جا سکتا تھا۔

عامل شاہ کے گھر کے زیورات اور نقدی نکل گئی۔ لوگوں نے کہا کہ چور جائیں گے کہاں؟ شام تک شاہ صاحب انہیں گھر سے جا پکڑیں گے۔ چور کا حُلیہ تک بتا دینا عامل شاہ کی خاص کرامات تھی مگر شام پر شام گذرنے لگی عامل شاہ اپنے گھر کی چوری کا سراغ نہ لگا سکا۔ پولیس نے بہت زور لگایا۔ کھوجیوں نے کھُرے اٹھائے۔ بہت مشتبہ بٹھائے گئے مگر کچھ پتہ نہ چلا۔

یہ تفتیش تھانے کے کاغذوں میں رہ گئی۔ عامل شاہ اب بُجھا بُجھا دکھائی دینے لگا لیکن اُس کی شہرت، عقیدت اور اُس کی بدکاری میں کوئی فرق نہ آیا۔ اُس کے جنّ چوروں کا سراغ نہ لگا سکے۔ اس کے باوجود لوگ اُسے جنّوں کا بادشاہ مانتے رہے اور اُس کے متعلق یہ عقیدہ قائم رہا کہ وہ بے اولاد عورتوں کو اولاد دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اور اُس کے خاص مرید ایسے الفاظ میں پروپیگنڈہ کرتے تھے جو بے معنی ہونے کے باوجود سادہ لوگوں کے دلوں پر اثر کرتے تھے۔

آخر ایک چور پکڑا گیا۔ وہ قریب کے ایک گاؤں کا نوجوان تھا اور وہ اکیلا نہیں تھا۔ یہ پتہ نہیں چل سکا کہ اس کے ساتھ دو آدمی تھے یا زیادہ تھے۔ یہ واردات ہیڈ کانسٹیبل نے مجھے جس طرح بتائی، یوں ہوئی کہ آدھی رات کے بعد عامل شاہ کو گھر میں کچھ دبا دبا سا شور سنائی دیا۔ وہ خنجر لے کر باہر نکلا۔ اس کے دماغ پر شراب کا نشہ سوار تھا۔ چاندنی میں صحن میں سب کچھ نظر آتا تھا۔ عامل شاہ نے دو آدمی دیکھے جو اُس کی چھوٹی بیوی کو جس کی عمر چوبیس پچیس سال تھی، اٹھائے ہوئے صحن والے دروازے میں سے نکل رہے تھے۔ دروازے میں بھی ایک یا دو آدمی کھڑے تھے۔ عامل شاہ نے شور بپا کر دیا۔ اس کے دو خاص مرید جو ڈیوڑھی میں سوتے ہوتے تھے، جاگ کر دوڑے آئے۔ وہ باہر

کی طرف سے آئے۔ اندر سے عامل شاہ نے چوروں پر خنجر سے حملہ کر دیا لیکن کسی کو زخمی نہ کر سکا۔ چور اُس کی بیوی کو پھینک کر بھاگ گئے لیکن ایک پکڑا گیا۔ اُس کا اصل نام کچھ اور ہے۔ اسے ہم رحیم کہہ لیتے ہیں۔

رحیم کو عامل شاہ نے رسّیوں سے بندھوا دیا۔ صبح اُسے تھانے لے جاتے ہوئے اُس کے گاؤں سے گذرے۔ رحیم کو دیکھ کر گاؤں کے لوگ باہر نکل آئے۔ اُس کی عمر بیس اکیس سال تھی۔ تماشائیوں میں اُس کی ماں بھی تھی۔ عامل شاہ گاؤں میں رُک گیا اور گاؤں والوں کو بتانے لگا کہ رحیم اُس کے گھر ڈاکہ ڈالنے آیا تھا اور پکڑا گیا۔

رحیم نے بلند آواز سے کہا ـــ "سنو گاؤں والو! میں اسی کا بیٹا ہوں۔ وہ سامنے میری ماں کھڑی ہے۔ اسے مسجد میں لے جا کر اس کے سر پر قرآن رکھوا اور پوچھو کہ میں کس کا بیٹا ہوں۔ وہ سامنے میرا باپ کھڑا ہے۔ اُس نے مجھے بتایا تھا کہ تم میرے نہیں عامل شاہ کے بیٹے ہو"

لوگ تو اس طرح خاموش رہے جیسے وہ وہاں تھے ہی نہیں، عامل شاہ نے رحیم کے منہ پر تھپڑ مار کر اسے گالی دی۔ رحیم کے ہاتھ پیٹھ پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ اُس نے عامل شاہ کے پیٹ میں لات ماری اور اُسے دوہرا کر دیا۔

"تم سب بے غیرت ہو" ـــ رحیم نے گاؤں والوں سے کہا ـــ "مجھ سے پوچھو یہ بے اولاد عورتوں کو اولاد کس طرح دیتا ہے۔ اس گاؤں کے بہت سے بچّوں کا باپ یہ شخص ہے"

گاؤں والوں نے رحیم کو پتھر تو نہ مارے، اُسے اس طرح گالیاں دینے لگے کہ ایک شور بپا ہو گیا ـــ "لے جاؤ اسے تھانے میں.... جان سے مار دو.... زبان کاٹ دو کمین کی.... جُوتے مارو"

رحیم کو تھانے لے گئے۔

رحیم کون تھا؟ ـــ یہ میں آپ کو اسی کی زبانی سناؤں گا۔ جس طرح جناب احمد یار خان نے اپنی کہانی "ناجو کا جن" میں لکھا ہے کہ دیہات

کی ہر عورت ایسی نہیں ہوتی کہ اپنی عزّت کسی پیر کو دے دے، اسی طرح رحیم ایسا دیہاتی تھا جو نہ پیروں کو مانتا تھا اور نہ عامل شاہ جیسے عاملوں کو۔

وہ بالکل اَن پڑھ، آوارہ اور بدمعاش تھا۔

تھانے میں رحیم اور سکھ تھانیدار کے درمیان جو کچھ ہُوا وہ میں آپ کو اپنے ہیڈ کانسٹیبل دوست کی زبانی سناتا ہوں۔ اس ہیڈ کانسٹیبل کو تھانیدار نے اپنے ساتھ رکھا تھا کیونکہ اُسے یہ نظر آ رہا تھا کہ رحیم اقبال جرم نہیں کرے گا اور اسے پھینٹی لگانی پڑے گی۔ ہیڈ کانسٹیبل اس کام کا ماہر تھا لیکن سکھ تھانیدار نے رحیم کے ساتھ ایسی باتیں کیں کہ اُس نے اقبال جرم بغیر پھینٹی کر لیا۔

اُس نے صرف اس واردات کا ہی اقبال نہ کیا جو ناکام ہو گئی تھی بلکہ اُس نے یہ انکشاف بھی کیا کہ عامل شاہ کی بیٹی کو اُسی نے انہی دو ساتھیوں کے ساتھ خراب کیا تھا۔ عامل شاہ کی گھوڑی کو اُسی نے زہر دیا تھا اور عامل شاہ کے گھر نقب بھی اُسی نے لگائی اور ڈاکہ ڈالا تھا۔ اب وہ اُس کی چھوٹی بیوی کو اُسی سلوک کے لیے اٹھا کر لے جا رہے تھے جو انہوں نے عامل شاہ کی بیٹی کے ساتھ کیا تھا۔ اس کے بعد اس کا ارادہ عامل شاہ کو قتل کر کے یہ ڈرامہ ختم کر دینے کا تھا۔

"میرے جسم کو بوٹی بوٹی کر دو" ـــ رحیم نے تھانیدار اور ہیڈ کانسٹیبل سے کہا ـــ "مجھے آگ پر لٹا دو۔ میں اپنے کسی ساتھی کا نام نہیں بتاؤں گا۔ صرف یہ بتا دیتا ہوں کہ دونوں سکھ تھے"

ہیڈ کانسٹیبل نے مجھے سنایا کہ تھانیدار نے اُس پر ذرا سا بھی زور نہ دیا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے نام بتائے۔ اُس نے رحیم سے اتنا ہی کہا ـــ "تم بتا دو گے رحیمے! تمہاری زبان اپنے آپ نام لے گی"

رحیم نے جو بیان دیا اور اس کے متعلق پولیس نے گاؤں سے جو معلومات حاصل کیں، ان سے ایک کہانی بن گئی اور اس کا پس منظر بھی بن گیا۔ یہ سب مجھے ہیڈ کانسٹیبل نے اس طرح سُنایا کہ رحیم اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔

بہن بھی کوئی نہیں تھی۔ اُس نے جب ہوش سنبھالا تو دیکھا کہ اُس کا باپ روکھی طبیعت کا آدمی ہے جو اُسے اُٹھاتا نہیں اور اسے بلاتا بھی نہیں۔ وہ چلنے پھرنے لگا تو باپ نے پہلے اُسے ڈانٹنا پھر اُسے مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ اُسے صرف ماں سے پیار ملتا تھا لیکن ماں اُس کے باپ سے ڈری ڈری رہتی تھی۔ رحیم اور بڑا ہو گیا تو گھر سے باہر نکلنے لگا۔ باپ اس کے لیے پہلے سے زیادہ ظالم ہو گیا۔

اب رحیم باتیں سمجھتا اور سوچتا بھی تھا۔ اُس کی ماں اُسے باپ سے بچاتی تھی۔ باپ اُس کی ماں سے لڑتا تھا اور زیادہ غصّے میں آتے تو ایک دو تھپڑ بھی جڑ دیا کرتا تھا۔ رحیم گیارہ بارہ سال کا ہُوا تو اُس نے ماں سے کئی بار کہا کہ یہ شخص اُس کا باپ نہیں ہو سکتا۔ اُس نے ماں کو اکثر روتے دیکھا۔ اُس کا باپ کسان تھا اور غریب نہیں تھا۔ اُس نے اپنی عمر کا ایک نوکر رکھا ہُوا تھا جو کھیتی باڑی میں اس کی مدد کرتا تھا۔ یہ نوکر رحیم کے ساتھ پیار کرتا تھا اس لیے رحیم کو اچھا لگتا تھا۔

اس گھر کا حال یہ ہو گیا کہ رحیم کے ماں باپ آپس میں اکثر ناراض رہتے اور تیسرے چوتھے روز لڑتے تھے۔ رحیم نے یہ رویّہ اختیار کر لیا کہ باپ کو پریشان کرنے کے لیے ہر وہ حرکت کرتا جو اُس کے باپ کو بُری لگتی تھی۔ باپ اُسے کھیتی باڑی میں لگانا چاہتا تھا اور رحیم کام سے بھاگتا اور مار کھاتا تھا۔

اُسے بچپن کے وہ مزے نصیب نہ ہوئے جنہیں انسان مرتے دم تک یاد کرتا ہے۔ وہ دس گیارہ سال کی عمر میں ہی سفاک اور بے رحم بن گیا۔ گاؤں میں اس جیسے تین چار بچے تھے جو آوارہ ہو گئے تھے۔ ان میں سکھوں کے بچے بھی تھے۔ سکھوں کے گھروں میں شراب اس طرح پی جاتی تھی جس طرح مسلمان گھروں میں حقہ اور سگریٹ پیے جاتے ہیں۔ چودہ پندرہ سال کی عمر میں رحیم نے سکھ دوستوں سے شراب پینی شروع کر دی۔ اس عمر میں باپ نے اُسے کہنا شروع کر دیا ـــ "تم میری اولاد ہوتے تو تم میں خاندانی غیرت ہوتی۔"

پہلے پہل رحیم اسے بھی ایک گالی سمجھا لیکن باپ نے یہ گالی اُسے

کئی بار مختلف الفاظ میں دی تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ دیہات میں پندرہ سال کی عمر میں لڑکے جوان ہو جایا کرتے ہیں اور وہ سب کچھ جان جاتے ہیں جو ماں باپ اُن سے چھپاتے ہیں۔ رحیم بھی جوان ہو گیا تھا۔ اُسے اپنی ماں پر شک ہونے لگا لیکن ماں کو وہ مجسم پیار اور پاکیزگی سمجھتا تھا۔ گھر میں ماں نہ ہوتی تو وہ اس گھر سے کبھی کا بھاگ جاتا۔ اب باپ نے اُس کے دماغ میں ڈال دیا کہ وہ اُس کا بیٹا نہیں تو وہ اسی سوچ میں اُلجھ گیا۔

ایک روز وہ باہر سے گھر آیا تو اندر اُسے اپنے باپ اور ماں کے لڑنے کی آوازیں آئیں۔ وہ باہر رُک گیا۔ اُس کا باپ چلّا چلّا کر کہہ رہا تھا ـــ "تم مجھے یہ کہنے سے نہیں روک سکتیں .... میں بار بار کہوں گا کہ یہ لڑکا میرا نہیں یہ عامل شاہ کا بیٹا ہے۔"

رحیم کی ماں بہت اونچی آواز میں بولی ـــ "میں نے سولہ سترہ سال صبر اور اپنے اوپر جبر کیا ہے۔ آج یہ بھی سن لو۔ تم مجھے کہتے تھے کہ میں بچّہ پیدا نہیں کر سکتی۔ میں نے تمہیں ایک ہی بار کہا تھا کہ تم بچّہ پیدا کرنے کے قابل نہیں ہو تو تم نے میرے منہ پر تھپّڑ مارا تھا۔ تم نے مجھے دن رات کہا کہ بچّہ پیدا نہ ہُوا تو تم مجھے طلاق دے دو گے اور لوگوں سے کہو گے کہ یہ عورت نہیں ہیجڑا ہے۔ میں نے بچّہ پیدا کر کے تمہیں دکھا دیا۔ ہیجڑا میں نہیں تم ہو.... ہاں، یہ بچہ عامل شاہ کا ہے۔ جاؤ کسی اور عورت کے ساتھ شادی کر لو۔ وہ بھی تمہیں کسی اور کا بچّہ دے گی۔"

رحیم صحن میں کھڑا سن رہا تھا۔ اُس کی عمر اب سولہ سال ہو چکی تھی اور جسمانی لحاظ سے وہ پورا جوان ہو گیا تھا۔ اُسے تھپڑوں کی اور اُس کی ماں کی گالیوں کی آواز سُنائی دی۔ وہ دوڑتا ہُوا اندر گیا۔ اُس کا باپ اُس کی ماں کو پیٹ رہا تھا۔ رحیم نے پوری طاقت سے ایک گھونسہ اپنے باپ کے پیٹ میں مارا۔ باپ دوہرا ہو گیا۔ رحیم نے دو گھونسے جوڑ کر اُوپر سے ہتھوڑے کی طرح باپ کی کمر پر مارے۔ باپ پیٹ کے بل گرا۔ رحیم نے اسے گالیاں دے کر کہا ـــ "تم میرے باپ نہیں ہو میرے دشمن ہو۔ آج کے بعد میری ماں پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت نہ کرنا۔"

باپ آہستہ آہستہ اٹھا اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔ رحیم ماں کا حوصلہ بڑھا کر باہر نکل گیا۔ وہ ماں سے پوچھنا چاہتا تھا کہ عامل شاہ کی حقیقت کیا ہے لیکن کوئی بیٹا اپنی ماں سے ایسی بات نہیں پوچھ سکتا۔ رحیم مکمل طور پر وحشی بن چکا تھا۔ گاؤں میں اُس کے منہ آنے کی کوئی جرأت نہیں کرتا تھا لیکن ماں کے سامنے وہ موم ہو جاتا تھا۔

ایک روز اُس نے باپ کو کھیتوں میں دیکھا تو اُس کے پاس چلا گیا اور اُسے کہا کہ وہ اُسے بتائے کہ اُس کا باپ عامل شاہ کس طرح بنا تھا۔ باپ نے اُسے دھتکارنے کی کوشش کی۔

"یہ مجھے پتہ چل چکا ہے کہ تم میرے باپ نہیں ہو، پھر میں تمہارا ادب لحاظ کیوں کروں" — رحیم نے اُسے کہا — "میں تمہیں مار مار کر کام کے قابل نہیں چھوڑوں گا۔ مجھے سچی بات بتا دو۔"

باپ نے اُسے بتا دیا۔ اُس نے کہا — "میں بھی دوسروں کی طرح عامل شاہ کا مرید تھا اور سمجھتا تھا کہ اس کے تعویذوں میں اثر ہے کہ بے اولاد عورت کو اولاد ہو جاتی ہے۔ تمہاری ماں کو میں اُس کے پاس لے گیا تھا، پھر وہ خود جاتی رہی۔ تم پیدا ہوئے تو تمہاری شکل عامل شاہ سے ملتی تھی۔"

"میری ماں کو تم نے مجبور کر دیا تھا کہ وہ بچہ پیدا کرے" — رحیم نے کہا — "تم اپنے آپ کو بچہ پیدا کرنے کے قابل سمجھتے تھے اور قصور میری ماں کا بتاتے تھے۔ تم اُسے طلاق دے کر اُس کی ساری زندگی تباہ کرنے کی دھمکی دے رہے تھے۔"

اُس کے باپ نے تسلیم کر لیا کہ یہ اُسی کی غلطی ہے اور اُس نے یہ بھی کہا کہ عامل شاہ بدکار آدمی ہے اور یہ بھی کہ رحیم اُس کا نہیں عامل شاہ کا بیٹا ہے۔

یہاں سے رحیم کی زندگی کا رُخ کسی اور طرف ہو گیا۔ وہ اب جوان تھا۔ اُس نے دوسرے گاؤں کے ایسے بدمعاشوں کے ساتھ تعلقات پیدا کر لیے جو پولیس سے بھی ٹکر لے لیا کرتے تھے۔ اُس نے جرم کرنے والے پیشہ ور آدمیوں کے ساتھ بھی دوستی کر لی۔ وہ جوا کھیلتا اور شراب پیتا تھا۔

اس دوران اُس کی دوستی ایک گاؤں کی ایک لڑکی کے ساتھ ہو گئی۔ وہ عامل شاہ کا بیٹا تھا اس لیے اُسے عامل شاہ کا مردانہ حسن ملا تھا۔ اس کی ماں بھی خوبصورت تھی۔ اس لڑکی کے ساتھ اس کے درپردہ تعلقات چلتے رہے۔ ایک روز لڑکی نے اسے بتایا کہ عامل شاہ اُس کے پیچھے پڑ گیا ہے اور اُس کے باپ سے اُس کا رشتہ مانگ رہا ہے۔ اب عامل شاہ کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ ہو گئی تھی اور رحیم بیس سال کا ہو گیا تھا۔ عامل شاہ نے لڑکی کے باپ کو جنّوں کی دھمکی بھی دی تھی۔

رحیم جل اُٹھا۔ ایک تو وہ اُس سے اپنی ماں کا انتقام لینے کا فیصلہ پہلے ہی کر چکا تھا۔ اب عامل شاہ نے اس لڑکی پر ہاتھ ڈالا جو اُس کی دوست تھی۔ رحیم کے دوستوں میں ایک آدمی ایسا بھی تھا جو عامل شاہ کا خاص آدمی تھا۔ وہ پکّا بدمعاش تھا۔ رحیم نے اُس کے ساتھ بات کی تو اُس آدمی نے اُسے بتایا کہ صرف عامل شاہ نہیں بلکہ کسی بھی شاہ اور پیر کے پاس کوئی خدائی طاقت نہیں ہوتی۔ یہ سب زبان کا ہیر پھیر ہے۔ لوگ مجبور ہوتے ہیں اور سیدھے سادے بھی اس لیے وہ پھنس جاتے ہیں۔

رحیم نے عامل شاہ کے اس آدمی کو گانٹھ لیا۔ رحیم نے اسے بتایا کہ وہ عامل شاہ کی بیٹی کو اغوا کر کے انتقام لینا چاہتا ہے۔ اس آدمی نے رحیم کو بتایا کہ یہ لڑکی ایک آدمی کو بُری طرح چاہتی ہے اور ان کی ملاقاتیں اکثر رات کو عامل شاہ کے باغ کے ایک کونے میں ہوتی ہیں۔ ایک عورت پیغام لایا کرتی ہے۔ عامل شاہ کے اس خاص آدمی نے ایک روز اس عورت سے کہا کہ عامل شاہ کی بیٹی کو رات باغ میں بھیجنا ہے۔

عورت نے یہ کام کر دیا اور پیسے وصول کیے۔ رحیم کو پہلے بتا دیا گیا تھا۔ وہ دو سکّھوں کو ساتھ لے کر پہنچ گیا۔ لڑکی اپنے چاہنے والے کے لیے باغ میں اُس وقت گئی جب گھر والے سو گئے تھے اور وہ رحیم اور اُس کے ساتھیوں کے ہاتھ چڑھ گئی۔

جس عورت کی لاش درخت کے ساتھ لٹکی ہوئی ملی تھی، اُس کے

متعلق رحیم کو بتایا گیا تھا کہ عامل شاہ کی خاص عورت ہے اور وہ عورتوں کو پھانس پھانس کر لاتی ہے۔ وہ چونکہ خود گندے چال چلن کی عورت تھی اس لیے رحیم کے لیے یہ مشکل نہیں تھا کہ وہ اسے باہر لے جاتا۔ اُس نے دن کے وقت اس عورت سے کہا کہ رات فلاں جگہ آجانا۔ وہ آگئی۔ یہی دو سکھ رحیم کے ساتھ تھے۔ اُنہوں نے اس عورت کا گلا گھونٹا پھر اس کے کپڑے اتارے اور تینوں نے مل کر اس کی لاش درخت سے اس کے بالوں سے باندھ کر لٹکا دی۔

نقب بھی رحیم اور اس کے سکھ ساتھیوں نے لگائی تھی۔ رحیم نے تھانیدار کو بتا دیا کہ اُنہوں نے زیورات کہاں فروخت کیے تھے۔ عامل شاہ کی گھوڑی کے چارے میں زہر رحیم نے اپنے ہاتھوں ملایا تھا۔ وہ دیوار پھلانگ کر اندر گیا تھا۔

اس کے بعد انہوں نے عامل شاہ کی چھوٹی بیوی کے اغوا کا پروگرام بنایا مگر جس طرح وہ ناکام ہوئے وہ آپ سُن چکے ہیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ اس عورت کو کہیں دُور لے جا کر کسی ایسے آدمی کے ہاتھ بیچ دیں گے جو اس کے ساتھ شادی کر لے مگر پکڑے گئے۔ آخر میں رحیم نے بتایا کہ وہ عامل شاہ اور اس کے بعد اپنے باپ کو قتل کرنا چاہتا تھا۔

رحیم نے اقبالی بیان دے دیا۔ سکھ تھانیدار اُسے ایک مجسٹریٹ کے پاس یہ بیان لکھوانے کے لیے لے گیا۔ عدالت میں وہی اقبالی بیان تسلیم کیا جاتا ہے جو مجسٹریٹ کے سامنے دیا جائے۔ مجسٹریٹ بیان لکھ کر ملزم کو سُناتا ہے اور اُس سے انگوٹھا لگوا لیتا ہے۔ اگر ملزم بیان نہ دینا چاہے تو مجسٹریٹ ملزم کو پولیس کے حوالے نہیں کرتا بلکہ حوالاتی کے طور پر جیل بھیج دیتا ہے۔ رحیم نے مجسٹریٹ کے سامنے جا کر بیان دیا کہ تھانے میں اُسے مارا پیٹا گیا اور بھوکا رکھا گیا اور اُسے مار مار کر منوایا گیا ہے کہ وہ یہ بیان دے۔ وہ کوئی بیان نہیں دینا چاہتا نہ اُس نے کوئی جرم کیا ہے۔

مجسٹریٹ نے اُسے جیل بھیج دیا۔

تھانیدار کو رحیم نے جو بیان دیا تھا اس کے مطابق اُس نے مقدمہ تیار کیا۔ گواہ بنائے۔ عامل شاہ کے خاص آدمی اور عورت کو بھی گرفتار کیا۔ کوئی ایک مہینہ بعد چالان عدالت میں پیش ہُوا۔ مجسٹریٹ نے دو مہینے بعد کیس سیشن کورٹ میں بھیج دیا۔ وہاں مقدمہ چلا اور سیشن جج نے رحیم کو شک کا فائدہ دے کر بری کر دیا۔

میرے ہیڈ کانسٹیبل دوست نے مجھے یہ کہانی سنائی تو میں نے اُسے کہا کہ عجیب بات ہے کہ رحیم نے اتنا صاف بیان دیا پھر تھانیدار رحیم کے دو سکھ ساتھیوں کو نہ پکڑ سکا۔ یہ معلوم کرنا مشکل تو نہیں تھا کہ وہ کون ہیں۔ کئی لوگوں نے انہیں رحیم کے ساتھ دیکھا ہوگا۔ یہ سکھ تھانیدار اناڑی ہوگا یا اس نے رحیم سے منہ مانگی رشوت لی ہوگی۔

"کچھ بھی نہیں لیا تھا"۔ ہیڈ کانسٹیبل نے ہنس کر کہا۔ "یہ سکھ تھانیدار بڑا ہی قابل اور تجربہ کار آدمی تھا لیکن اُس نے مجھے کہہ دیا تھا کہ وہ رحیم کو سزا نہیں ہونے دے گا۔ اُس نے خود رحیم سے کہا تھا کہ مجسٹریٹ کو بیان دینے سے انکار کر دینا۔ کہنا کہ تھانے میں مجھے مارا پیٹا گیا ہے۔ رحیم نے ایسے ہی کیا۔ تھانیدار نے جو مقدمہ تیار کیا اس کی چُولیں خود ڈھیلی رکھیں اور اس طرح رحیم اور اُس کے ساتھی بری ہو گئے .... اس تھانیدار نے ان وارداتوں سے پہلے عامل شاہ سے کئی بار کہا تھا کہ وہ اپنی نوسر بازی ختم کر دے کیونکہ اُس کا گھر بدمعاشی کا اڈہ بنا ہُوا ہے۔ عامل شاہ نے تھانیدار کو دھمکیاں دی تھیں .... تھانیدار نے رحیم سے منوا لیا تھا کہ وہ اس علاقے میں کوئی واردات نہ کرے، نہ عامل شاہ کو قتل کرے نہ اپنے باپ کو۔ اس کے بعد رحیم کہیں نظر نہیں آیا۔"



خانقاہ کے سائے میں

عورت ہمارے گاؤں کے باہر بے ہوش پڑی تھی۔ گاؤں والے مجھے اپنا لیڈر سمجھتے تھے۔ مجھے اطلاع ملی تو جا کے دیکھا۔ وہ زندہ تھی۔ بڑی خوبصورت عورت تھی۔ عمر تیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ ہمارے گاؤں کی نہیں تھی۔ میں اُسے اپنے گھر اُٹھوا لایا۔ یہ وہ دن تھے جب دوسری جنگِ عظیم میں جاپان ہتھیار ڈال چکا تھا اور جرمنی کی فوجیں شکست کھاتی تیزی سے پسپا ہو رہی تھیں۔

میں ایک مہینے کی چھٹی پر گاؤں آیا ہُوا تھا۔ میں فوج میں ایجوکیشن صوبیدار تھا۔ تعلیم تو میری میٹرک تھی، آرمی کے امتحان پاس کرکے میں اندھوں میں کانا راجہ بن گیا تھا۔ گاؤں میں میری حیثیت یہ تھی کہ میرے مشورے اور فیصلے مانے جاتے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو میری صوبیداری تھی۔ دوسری وجہ یہ کہ جنگِ عظیم میں فوجی کا رُعب چلتا تھا۔ انگریز بادشاہ نے ہمیں لڑانے کے لیے بہت زیادہ پھُونک دے رکھی تھی اور تیسری وجہ یہ تھی کہ میں اونچی ذات کا فرد تھا۔ زمین اور جائیداد بے شمار تھی۔ میرے خاندان میں مرد بھی بہت تھے۔ دیہات میں یہی چیزیں انسان کو بادشاہ بناتی ہیں۔

صبح سویرے کسی نے اس عورت کو گاؤں کے باہر پڑے دیکھا تو اُسے کسی نے ہاتھ بھی نہ لگایا۔ مجھے اطلاع دی گئی۔ گھر لانے کے بعد دیکھا کہ اُس کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ عام دیہاتی عورتوں کی طرح وہ گندمی یا سانولے رنگ کی نہیں تھی۔ اُس کے مُنہ میں پانی ٹپکایا، پھر قطرہ قطرہ دودھ دیا۔ ہمارے

گاؤں میں ایک نیم حکیم بھی تھا۔ اُس نے اُسے کچھ سونگھایا۔ آدھے گھنٹے بعد اُس نے آنکھیں کھولیں تو گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ منہ سے کچھ نہ بولی۔ ڈرے ہُوئے بچے کی طرح سب کو باری باری دیکھتی تھی۔ میری بیوی نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور تسلّی دی کہ وہ اپنے ہی گھر میں ہے، گھبرائے نہیں۔ میں نے بھی اُسے دلاسہ دیا۔ اُس کے آنسو بہنے لگے۔ اُسے لیٹے رہنے کو کہا تو اُس نے پانی مانگا۔ پانی پلا کر اُسے دُودھ پلایا گیا۔

”میرے گاؤں کا کوئی آدمی آیا ہے؟“۔ اُس نے پوچھا — ”یہ کونسا گاؤں ہے؟ میں اس گھر میں کس طرح آئی ہوں؟“

اُس نے نحیف آواز میں اتنے سارے سوال کر ڈالے۔ ہم میں سے کسی نے اِس گاؤں کا نام بتایا تو اُس نے پُوچھا — ”میرا گاؤں کتنی دُور ہے؟“

مجھے شک ہُوا کہ اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ اس کی حالت بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور کون سے گاؤں کی رہنے والی ہے۔

اُس نے سب کو باری باری دیکھا اور کہا — ”پھر تم لوگ مجھے میرے گاؤں بھیج دو گے؟“

”تم اپنے گاؤں نہیں جانا چاہو گی؟“ — میں نے پوچھا۔

”نہیں“۔ اُس نے سر ہلا کر سرگوشی میں کہا۔

لباس اور شکل وصورت سے وہ کسی چھوٹے گھر کی عورت نہیں لگتی تھی۔ وہ پاگل بھی نہیں تھی۔ میں نے اُس سے پُوچھا کہ وہ اپنے گاؤں نہیں جائے گی تو اور کہاں جائے گی؟

”میں تھانے جا رہی تھی“۔ اُس نے کہا — ”تھانہ کتنی دُور ہے؟ تم مجھے تھانے پہنچا دو۔“

”کیوں؟“ — میں نے پوچھا — ”وہاں جا کے کیا کرو گی؟“

جواب دینے کی بجائے وہ گھبرا گئی۔ میں اُس سے یہ پوچھنا ضروری سمجھتا تھا کہ وہ تھانے کیوں جا رہی ہے۔ وہ مظلوم لگتی تھی۔ دیہاتی علاقے میں اُس زمانے میں بھی عورت کو مویشی اور کھلونا سمجھا جاتا تھا، آج بھی عورت کی حیثیت اور حالت وہی ہے۔ وہ زمانہ ہندوؤں اور سکھوں کا تھا۔ اُن دنوں ہمارے علاقے کے تھانے میں تھانیدار سکھ اور اُس کا اسسٹنٹ ہندو تھا۔ وہ خبیث لوگ تھے۔ عورت مسلمان اور خوبصورت تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ یہ اکیلی اُن کے پاس چلی گئی تو اُن کے ہاتھوں خراب ہو گی۔ اسی لیے میں اُس سے پوچھنا ضروری سمجھتا تھا کہ وہ تھانے کیوں جا رہی ہے اور اگر اس کا تھانے جانا ضروری ہے تو میں اس کے ساتھ چلوں گا مگر وہ کچھ بتاتی نہیں تھی۔

اتنے میں میرے گاؤں کا ایک آدمی اندر آیا۔ اُس نے مجھے اشارے سے باہر چلنے کو کہا۔ میں باہر گیا تو اُس نے مجھے بتایا کہ فلاں گاؤں کے دو آدمی اِدھر سے گزرے تو انہوں نے اس سے پوچھا کہ ایک عورت اِدھر سے گزری ہے؟ انہوں نے عورت کا حلیہ بھی بتایا۔ وہ یہی عورت ہو سکتی ہے۔ اس آدمی نے یہ عقلمندی کی کہ انہیں یہ کہہ کر باہر کھڑا کر آیا کہ یہیں ٹھہرو، میں گاؤں میں کسی اور سے پوچھ آتا ہوں۔ وہ میرے پاس آیا اور مجھ سے پوچھا کہ کیا انہیں یہ عورت دکھا دی جائے؟ وہ شاید اسی کو ڈھونڈ رہے ہیں۔

میں نے اندر جا کر اس عورت سے کہا کہ تمہیں دو آدمی ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ وہ خوفزدہ ہو گئی۔ میں نے اُسے اور زیادہ ڈرانے کے لیے کہا کہ آؤ تم اُن کے ساتھ چلی جاؤ۔ اُس نے کچھ کہے بغیر ہاتھ جوڑ دیے اور اُس کے چہرے پر اُداسی بہت ہی گہری ہو گئی۔ وہ بالکل خاموش تھی۔ وہ چارپائی سے اُٹھی اور فرش پر بیٹھ کر اُس نے میری بیوی کے پاؤں پکڑ لیے۔ پھر کبھی مجھے دیکھتی کبھی میری بیوی کو۔

میں نے اُسے کہا کہ مجھے بتا دو کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ تھانے

جانا ہُوا تو میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔

وہ مان گئی۔ میں نے اپنے آدمی سے کہا کہ اُن دونوں سے کہہ دو کہ اس گاؤں میں کسی عورت کو نہیں دیکھا گیا۔ وہ چلا گیا تو میں نے سب کو باہر نکال کر اُسے بہت ہی تسلّی دی۔ اُسے ہر طرح کی مدد کا یقین دلایا۔ اُس سے پوچھا کہ وہ بے ہوش کیوں ہوئی تھی اور وہ اتنی کمزور کیوں ہے۔

"صرف پندرہ دن گزرے میرا بچّہ پیدا ہُوا ہے" ۔ اُس نے جواب دیا — "میں ابھی چلنے کے قابل نہیں تھی"— یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگی۔

میں نے باہر جا کر اپنی بیوی کو بتایا کہ یہ عورت تو اس حالت میں ہے۔ میری بیوی نے فوراً اُسے لٹا دیا اور معلوم نہیں کیا کیا اور اُسے کیا دیا۔ میں باہر رہا۔ ایک گھنٹہ گزر گیا۔ بیوی باہر آئی تو اُس نے مجھے بتایا کہ وہ سو گئی ہے۔ وہ تین چار گھنٹے سوتی رہی۔ وہ جاگی تو میری بیوی نے اُسے مقوی چیزیں کھلائیں۔ میں جب اندر گیا تو وہ اچھی حالت میں تھی۔

مجھے کہنے لگی — "اگر آپ سچّے دل سے مجھے اپنی بہن سمجھیں تو میں آپ کو بتا دوں گی کہ میں کون ہوں اور تھانے میں کیوں جا رہی تھی۔ اگر دھوکہ دینا ہے تو مجھے اللہ کے حوالے کر دیں۔ وہ تو انصاف کرے گا۔"

میں اُسے جس طرح یقین دلا سکتا تھا دلایا اور اُسے اللہ اور رسولؐ کی قسمیں کھا کر بہن کہا۔

اُس نے اپنے گاؤں کا نام بتا کر کہا کہ آٹھ سال گزرے اُس کی شادی ہوئی تھی۔ پانچ ساڑھے پانچ سال بعد اُس کا خاوند مر گیا۔ اس سے پہلے اُس کا ایک ہی بچّہ پیدا ہُوا تھا جو ڈیڑھ سال کا ہو کر مر گیا تھا۔ خاوند مرا تو اُس نے قسم کھالی کہ وہ دوسری شادی نہیں کرے گی۔ اس کا خاوند بہت ہی اچھا تھا۔ وہ اُسے دل سے اُتار نہیں سکتی تھی۔ خاوند کمزور خاندان کا آدمی تھا اور یہ عورت بھی ایسے ہی خاندان کی تھی۔ اب اس کی ماں تھی اور باپ۔ وہ انہی کے پاس رہتی تھی۔ دیہات میں جس خاندان میں مرد بہت کم ہوں

اُسے کمزور سمجھا جاتا ہے۔

اُسے دوسری شادی کے لیے کہا گیا۔ وہ نہ مانی۔ بعض نے اُسے پھانسنے کی کوشش کی۔ اشارے کیے، پیغام بھیجے، بہت کچھ کیا لیکن وہ کسی کے ہاتھ نہ آئی۔ اُسے تحفوں یا مالی لالچ سے نہیں خریدا جا سکتا تھا کیونکہ اُس کی زمین بہت تھی۔ یہ انہوں نے بٹائی پر دے رکھی تھی۔ اُسے کھانے اور پہننے کی کوئی کمی نہیں تھی، وہ دوسروں کو کھلا اور پہنا سکتی تھی۔ اُس کے گاؤں میں اکثریت ایک ذات اور برادری کی تھی۔ اُس گاؤں میں سب مسلمان تھے۔ کوئی سکھ نہیں تھا۔ میں جالندھر کے علاقے کی بات کر رہا ہوں جہاں دیہاتی علاقے میں سکھ کاشتکار اور زمیندار بھی بہت تھے لیکن یہ گاؤں مسلمانوں کا بلکہ اسی برادری کا تھا۔

اس برادری میں ایک گھرانہ لٹھ بازی اور بدمعاشی میں مشہور تھا۔ ان کا زمیندارہ تھا۔ نمبرداری بھی اسی گھر میں تھی۔ چار پانچ بھائی تھے جو کسی کو سر نہیں اٹھانے دیتے تھے۔ ان بھائیوں میں سے ایک کی بیوی مر گئی تھی۔ اُس کی قریبی رشتہ داری میں لڑکیاں تھیں۔ اُسے دوسری شادی کے لیے کہا گیا لیکن اُس نے اس عورت کے ساتھ شادی کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اُس کی ماں پیغام لے کر گئی تو اس عورت نے اپنی زبان سے صاف جواب دے دیا۔ (اس آدمی کو آپ اختر حسین کہہ لیں اور عورت کو زینب۔ مجھے صحیح نام ظاہر نہیں کرنے چاہئیں)۔ اختر حسین کو بہت بُرا لگا۔ اُس نے زینب کو دھمکی بھیجی کہ وہ اسی کے ساتھ شادی کرے گا۔ وہ ایک بار نہیں سو بار انکار کرے۔

زینب عام طور پر خاموش رہتی تھی۔ یہ اُس کی عادت تھی۔ اس نے دھمکی سُن لی، کوئی جواب نہ دیا۔ زینب خوبصورت تھی اور اختر حسین بھی کم نہیں تھا۔ بڑے اچھے جسم کا جوان تھا اور بہت دلیر۔ اُس نے گاؤں کی ایک عورت کو زینب کے پیچھے ڈال دیا۔ اُسے اختر اُجرت دیتا تھا۔ یہ عورت زینب کے پاس جاتی اور اختر کی تعریفیں کرتی اور اسے بتاتی کہ

کون کون سی خوبصورت لڑکی اختر پر مرتی ہے مگر وہ اس (زینب) کے سوا کسی کے ساتھ بات تک نہیں کرتا۔ یہ عورت ایسے ہی جال پھینکتی رہتی اور اسے سبز باغ دکھاتی رہتی تھی۔ زینب اکثر ہنس کر ٹال دیتی یا صرف سُن لیتی اور کہتی کہ خالہ جسے میرے دل نے پسند کیا تھا وہ مر گیا ہے۔ اب دُنیا کا کوئی مرد اچھا نہیں لگتا۔

بعد میں میں نے بھی اختر حسین کو دیکھا تھا اور میں حیران ہُوا کہ زینب نے ایسے خوبصورت جوان کو کیوں پسند نہیں کیا تھا۔ وہ صرف خوبصورت اور جوان ہی نہیں تھا، وہ مالدار زمیندار تھا اور دو تین گاؤں پر اُس کا رعب اور حکم چلتا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ زینب کا کردار بہت اونچا تھا اور اُسے اپنے خاوند کے سوا کوئی اور اچھا نہیں لگتا تھا۔

اُس نے بتایا کہ اُس کے ماں باپ کو جب پتہ چلا کہ اختر حسین زینب کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے تو وہ بھی زینب کے پیچھے پڑ گئے کہ وہ اختر حسین کو قبول کرلے مگر زینب نے ہاں نہ کہی۔ ماں کے ساتھ اُس کا کئی بار لڑائی جھگڑا بھی ہُوا۔ اس کا باپ کمزور طبیعت کا تھا۔ اُس نے زینب کی مِنّت کی کہ لوگوں کی اُلٹی سیدھی باتوں سے بچنے کے لیے وہ شادی کرلے۔ زینب نے اُس کی بھی نہ سُنی۔

باپ غلط نہیں کہہ رہا تھا کہ جوانی میں کوئی عورت بیوہ ہوجائے اور دوسری شادی کرنے سے انکار کردے تو لوگ اُس پر جھوٹے الزام تھوپنے لگتے ہیں۔ اُسے بدنام کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت کو مویشی سمجھا جاتا ہے جس کی کوئی حِس اور کوئی رُوح نہیں ہوتی۔ مرد سمجھتے ہیں کہ عورت جو کچھ ہے صرف جسم ہے اور جسم کی ضروریات کے لیے اُسے ہر وقت ایک مرد کی ضرورت رہتی ہے۔

زینب کے چال چلن کے متعلق بھی کھُسر پھُسر شروع ہوگئی۔ ایک روز اختر حسین نے کھیتوں میں اُس کا پیچھا کیا اور اُسے الگ تھلگ لے جاکر رُعب دار انداز سے شادی کے لیے کہا۔ زینب نے اُسے جذباتی طریقے سے

بتایا کہ اس کا خاوند اس کی نظروں کے سامنے سے نہیں ہٹتا۔ اختر حسین نے اُسے اپنے متعلق کہا کہ وہ اُس کے مرے ہُوئے خاوند سے سَو درجے بہتر آدمی ہے۔ زینب نے ہاں نہ کی۔ اختر نے اُسے دھمکی دی کہ وہ اُسے اغوا کراسکتا ہے۔ کوئی ایسا دلیر مرد ابھی پیدا نہیں ہُوا جو اُسے چھڑا لے گا۔

"تم زبردستی کرسکتے ہو"۔ زینب نے اطمینان کے لہجے میں کہا — "مجھے اللہ کی ذات کے سوا بچانے والا کون ہے؟ میرا ایک بھی بھائی ہوتا تو میں تمہاری دھمکی کا جواب کسی اور طریقے سے دیتی۔ تم مجھے زبردستی اپنے گھر لے جاؤ گے تو میں تم سے نفرت کروں گی اور تم محسوس کرو گے کہ تم کہیں سے ایک پتھر اٹھا لائے ہو۔ تم گیدڑوں اور گدھوں کی طرح میرے جسم کو نوچتے رہو گے اور میں تمہیں حقیر سمجھتی رہوں گی"۔

"کیا اب تم مجھ سے نفرت نہیں کرتی؟" — اختر حسین نے پوچھا۔

"نہیں"۔ زینب نے کہا — "نفرت کیوں کروں؟ اللہ تمہیں زندگی دے۔ تم اتنے خوبصورت جوان ہو۔ دیکھ کر دل خوش ہوجاتا ہے، مگر شادی نہیں کروں گی"۔

اس کے بعد اختر نے اُسے کئی بار روک کر شادی کے لیے کہا۔ آخر تنگ آکر اُسے یہ دھمکی دی کہ وہ اُسے بدنام کردے گا۔

"یہ بھی کرکے دیکھ لو"۔ — زینب نے غصے کا اظہار کرنے کی بجائے مسکرا کر کہا — "میں نیک نام تو رہی نہیں۔ تمہارے گھر کی عورتوں نے کہا ہے کہ میں رات کو فلاں اور فلاں کے پاس جاتی ہوں۔ میری بدنامی میں جو کسر رہ گئی ہے وہ تم پوری کرلو"۔

یہ حربہ بھی ناکام رہا تو اختر حسین نے ہتھیار ڈال دیئے اور اُس نے (جیسے افسانہ نویس لکھا کرتے ہیں) زینب سے محبّت کی بھیک مانگنی شروع کردی۔ اس نے کہا کہ اُسے اگر صرف عورت کی ضرورت ہوتی تو وہ اُس جیسی دس جوان عورتیں خرید سکتا تھا لیکن اُسے زینب اچھی لگتی ہے۔

اختر نے اُسے کوئی تحفہ پیش کیا جو زینب نے نہ لیا۔ اختر نے اُسے قسمیں کھا کر یہ بھی کہا کہ وہ اُس کی محبّت قبول کرلے تو وہ اس کے جسم کو ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔

زینب نے کہا کہ میں یہ محبّت ضرور قبول کرلوں گی۔ شرط یہ ہے کہ مجھے بہن بنالو۔ میرا کوئی بھائی نہیں۔ اختر سٹپٹایا۔ یہی تو اس کا مسئلہ تھا کہ وہ اسے بہن نہیں بنانا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ اُس کا دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ زینب نے اُس سے بھاگنے کی کوشش کبھی نہ کی۔ نفرت کا اظہار بھی نہ کیا۔ اُسے دھتکارا بھی نہیں۔ اُس کے رُعب اور دھمکیوں کو بھی تسلیم کرتی رہی اور دامن بھی بچاتی رہی۔

یہ تو میں بھی دیکھ رہا تھا کہ وہ جب مجھے یہ قصّہ سُنا رہی تھی تو وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بول رہی تھی۔ اُس کا یہ لہجہ میرے دل پر اثر کر رہا تھا۔ اُس کے انداز میں بناوٹ اور جھوٹ نہیں تھا۔ میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اُس کے اس لہجے اور انداز نے اختر حسین کو پریشان کردیا ہوگا۔ اس نے سُنایا کہ اختر نے محبّت کا اظہار کیا تو اس نے اختر کی محبّت قبول کرلی مگر اُس کا مقصد پورا نہ کیا۔ پھر اختر نے تنگ آکر اسے بدنام کرنے کی مہم چلائی۔ اُسے قتل کی دھمکی دی۔

اس دھمکی کے جواب میں زینب نے کہا "یہ طریقہ ٹھیک ہے۔ مجھے قتل کروا دو اور میری لاش کے ساتھ شادی کرلینا۔"

ایک روز اختر نے اس کے گھر آکر اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے اور کہا — "زینب مان جاؤ۔ میں تمہیں شرعی بیوی بنانا چاہتا ہوں۔ اب تو سارے گاؤں کو پتہ چل گیا ہے کہ میں تمہارا رشتہ مانگ رہا ہوں اور تم انکار کررہی ہو۔ یہ میرے خاندان کی بے عزّتی ہے۔"

"اور جب تم میرے ساتھ شادی کرلوگے تو تمہارے خاندان کی اور زیادہ بے عزّتی ہوگی" — زینب نے کہا — "سارے گاؤں میں تم ہی نے مشہور کیا ہے کہ زینب بدکار اور بدچلن ہے۔ تم مجھے شرعی بیوی بناکر گاؤں میں سر اُونچا کیسے کرسکو گے؟"

"یہ سب جھوٹ ہے" — اختر حسین نے غصّے سے کہا "میں جانتا ہوں کہ تم پاک صاف ہو۔"

زینب نہ مانی۔ اُسے یہ افسوس ضرور تھا کہ اُس کا باپ غم سے اور زیادہ بوڑھا ہوگیا تھا۔ یہ غم باپ کا ہی تھا کہ اُس کی جوان بیٹی بیوہ ہوکر گھر بیٹھی تھی اور وہ اتنے کھاتے پیتے گھر اور ایسے خوبصورت آدمی کا رشتہ قبول نہیں کررہی تھی۔ زینب نے اپنے باپ کو یہ نہیں بتایا کہ اُس کا مرحوم خاوند اُسے خواب میں ملا کرتا ہے اور وہ اسی ملاقات کو کافی سمجھتی ہے۔ اس کے جذبات کے ساتھ کسی کو دلچسپی نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے ہر کسی کی ہر بات برداشت کرتی رہی۔

دیہاتیوں کی سب سے خطرناک کمزوری توہم پرستی اور پیر پرستی ہے۔ بے چارے پسماندہ لوگ اپنی تقدیر خود تو بنا نہیں سکتے، اُن کی عقل پر مُلّا اور شاہ جی سوار رہتے ہیں۔ کوئی مشکل پیش آتی ہے تو پیر یا شاہ جی کے قدموں میں جا سر رگڑتے اور نذر نیاز دے کر دُعا اور تعویذ حاصل کرتے ہیں اور جب انہیں کوئی خوشی نصیب ہو تو بھی مُلّا اور شاہ جی کا پیٹ بھرتے اور مزاروں پر دیئے جلاتے ہیں۔

زینب بھی انہی لوگوں میں سے تھی۔ اس کے گاؤں کے قریب ایک خانقاہ تھی۔ اس میں جو کوئی دفن تھا اُس کا ادھیڑ عمر بیٹا اُس کی گدّی پر براجمان تھا۔ باز اور کتّوں کے شکار کا شوقین تھا۔ اُس کی کچھ کرامات مشہور تھیں۔ اس علاقے میں بڑا پیر تو ایک اور تھا جس کے مریدوں کا حلقہ بہت وسیع تھا لیکن اس خانقاہ والے شاہ صاحب کے پاس بھی لوگ جاتے اور مرادیں پوری کراتے تھے۔

زینب ہر جمعرات کی شام اس خانقاہ پر دیا جلانے جاتی اور شاہ صاحب کو بھی سلام کرآتی تھی۔ اس کا خاوند مرگیا تو اس نے ہر جمعرات دو دو دیئے جلانے شروع کردیئے۔ ایک خانقاہ پر دوسرا اپنے خاوند کی قبر پر۔ شاہ صاحب زینب پر ذرا زیادہ ہی مہربان تھے لیکن زینب سلام سے زیادہ اُس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتی تھی۔

جن دنوں اختر حسین زینب کی طرف سے مایوس ہو گیا انہی دنوں شاہ صاحب نے ایک جمعرات زینب کو خانقاہ کے سامنے روک لیا۔ اُسے معلوم تھا کہ وہ ہر جمعرات دیا جلانے آتی ہے۔ وہ اُس وقت خانقاہ سے باہر کھڑا تھا۔ زینب کو روک کر شاہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور اس کے سر کے اوپر اوپر اس طرح ہاتھ ہوا میں مارا جیسے اس کے سر پر کوئی چیز بیٹھی تھی جسے شاہ نے اُڑا دیا تھا۔ شاہ نے کہا — ”چل ہٹ جا پرے“

شاہ صاحب نے ہوا میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ زینب نے بھی دیکھا۔ اُسے ہوا میں کوئی پرندہ یا کوئی اور اُڑتی چیز نظر نہ آئی۔

”اوئے مان جاؤ یار!“ — شاہ صاحب نے ہوا میں دیکھتے ہوئے کہا — ”یہ میری پرانی مُریدنی ہے۔ کسی اور کے پاس جاؤ“

زینب ڈر گئی۔ اُس نے پوچھا — ”شاہ جی! کیا ہے؟“

”ڈرو نہیں“ — شاہ نے کہا — ”یہ میرے دو جِنّ ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ آؤ وہ آ رہی ہے۔ وہ چلے گئے۔ میں باہر نکل آیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کسی عورت کے پیچھے گئے ہیں۔ باہر آیا تو تم آ رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ دونوں تمہارے اُوپر اُوپر آ رہے تھے۔ تمہارا دوپٹہ سر سے اُتر نہیں گیا تھا؟“

زینب کو یاد آ گیا کہ خانقاہ کی طرف آتے، کچھ دُور اس کا دوپٹہ سر سے سرک گیا تھا جو اس نے سر پر لے لیا تھا۔ میرے خیال میں دوپٹہ تیز چلنے سے اور ہوا سے سر سے اُترا ہو گا اور شاہ نے دیکھ لیا ہو گا۔

”تمہارا دوپٹہ ان جِنّوں نے اتارا تھا“ — شاہ صاحب نے زینب سے کہا۔ زینب کا رنگ پیلا پڑتا دیکھ کر شاہ نے کہا — ”ڈرو نہیں، یہ جِنّ بدمعاش نہیں۔ یہ پیار کرنے والے جِنّ ہیں۔ میں نے ایک روز پہلے بھی دیکھا تھا کہ یہ دونوں تمہیں بہت پسند کرتے ہیں“

زینب اس عقیدے کو مانتی تھی کہ جِنّ انسان میں داخل ہو جاتے ہیں اور تنگ کرتے ہیں۔ اُس نے شاہ صاحب سے اس خطرے اور خوف

کا اظہار کیا تو شاہ صاحب نے اُسے تسلّی دی کہ یہ جِنّ تنگ کرنے والے نہیں ہیں۔ یہ تو اُس پر فریفتہ ہو گئے ہیں۔ ان سے فائدہ مل سکتا ہے نقصان نہیں ہو گا۔

زینب کے دل سے ڈر نکلا نہیں۔ اس کی نظر میں جِنّ جِنّ ہی تھے اور جِنّوں کی اُس نے بڑی ہی خوفناک باتیں سُنی تھیں۔ دو دن اس کی یہ حالت رہی کہ مُنہ پر مکھی بیٹھ کر اُڑ جاتی تو وہ اسے جِنّ سمجھ لیتی تھی۔ اُسے اُٹھتے بیٹھتے اپنے ارد گرد جِنّ گھومتے پھرتے محسوس ہوتے تھے۔ تیسرے چوتھے دن وہ شاہ صاحب کے پاس چلی گئی۔ اُسے بتایا کہ وہ ہر وقت جِنّوں سے ڈرتی رہتی ہے اور جِن شاید اس کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ شاہ نے اس کا شک یقین میں بدل دیا اور کہا — ”وہ تمہاری حفاظت کرتے ہیں اور وہ یہ بھی پسند نہیں کرتے کہ تم اس جوانی میں بوڑھی رہو“ اُس نے گہری سوچ میں پڑ کر کہا — ”کل دوپہر کے بعد آنا۔ میں تمہارا ڈر دُور کر دوں گا“

وہ دوسرے دن شاہ کے گھر گئی۔ وہ اپنے خاص کمرے میں اکیلا تھا۔ زینب کو دیکھ کر اُس نے اپنے آپ سے کوئی باتیں شروع کر دیں۔ پھر اس طرح چونکا جیسے بیدار ہو گیا ہو۔ اُس نے دو کورے کاغذ نکالے۔ دونوں پر خانے بنائے۔ ان میں کچھ لکھا۔ زینب اَن پڑھ تھی۔ شاہ نے اس کے ہاتھ سے انگوٹھے پر سیاہی مل کر ایک انگوٹھا ایک کاغذ پر لگوایا۔ دوسرا انگوٹھا دوسرے کاغذ پر لگوایا، اور ایک بار پھر انگوٹھے پر سیاہی مل کر ایک اور انگوٹھا ان کاغذوں کے نیچے کسی اور کاغذ پر لگوا لیا۔ شاہ زور سے کھانسا۔ اس کے ساتھ ہی اختر حسین حجرے میں داخل ہُوا۔ زینب اُسے دیکھ کر گھبرائی یا ڈری نہیں۔

”تم کیوں آئے ہو؟ جاؤ“ — شاہ نے حیران ہو کر اختر سے کہا — ”یہاں سے چلے جاؤ“

اختر حسین نے شاہ کے پاؤں پکڑ لیے اور کہا — ”یا سرکار! میں بڑی

مجبوری کی حالت میں آیا ہوں۔ میں گھر میں بیٹھا تھا کہ میرے مُنہ پر کسی نے ہاتھ پھیرا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ کسی نے ہاتھ ضرور پھیرا تھا۔ میں نے اسے وہم سمجھ لیا.... پھر کسی نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ وہ جو کوئی بھی تھا اُس کا ہاتھ برف کی طرح سرد تھا۔ وہ نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے کلمہ شریف پڑھنا شروع کر دیا۔ پھر کسی نے مجھے پیچھے سے دھکیلا۔ یہ ہاتھ بھی سرد تھے۔ میں اُٹھ کھڑا ہُوا۔ میرا پسینہ نکل آیا تھا۔ میں نے گھر والوں کو بتانے کا ارادہ کیا تو میری زبان سے آواز نہ نکلی۔ پیچھے سے کوئی مجھے دھکیل رہا تھا۔ میرے دماغ پر بھی اُسی کا قبضہ ہو گیا جو مجھے دھکیل رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ ہاتھ مجھے باہر لے جانا چاہتے ہیں۔ میں چلتا گیا اور آپ کے پاس پہنچا دیا گیا۔ اب آپ ہی مجھے بتائیں کہ مجھے کون یہاں لایا ہے؟"

شاہ صاحب عجیب طرح سے مسکرایا اور اُس نے چھت کی طرف دیکھا۔ پھر اُس کی نظریں چھت پر گھومنے پھرنے لگیں۔ اُس نے کہا۔ "تم لائے ہو اِسے؟" — کچھ اور باتیں اور عجیب و غریب حرکتیں کر کے اُس نے مُسکرا کر زینب سے کہا — "اللہ مبارک کرے۔ تم اس کے ساتھ چلی جاؤ۔" اُس نے اختر کی طرف اشارہ کیا۔

زینب کچھ نہ سمجھ سکی۔ اُس نے کہا — "میں اس کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ لوگ دیکھ کر شک کریں گے۔"

"وہ اب لوگ کیا شک کریں گے؟" — شاہ نے کہا — "ان جنّوں نے تو اس کے ساتھ تمہارا نکاح پڑھ دیا ہے۔ یہ دیکھو اپنا انگوٹھا" — شاہ نے اُسے نکاح کا رجسٹر دکھایا۔ اس کے ایک خانے میں زینب کا انگوٹھا لگا ہُوا تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ اُس نے دو کورے کاغذوں پر تعویذ کے الفاظ لکھ کر زینب کے انگوٹھے لگوائے تھے۔ تیسرا انگوٹھا اُس نے نکاح کے رجسٹر پر لگوا لیا جو ان کاغذوں کے نیچے پڑا تھا۔ یہ شاہ نے خود ہی رکھا ہُوا تھا۔

زینب تڑپ اُٹھی۔ وہ اختر حسین کے ساتھ شادی کرنے کے لیے

تیار نہیں تھی، لیکن اُس نے دیکھا کہ اختر حسین بھی ایسی باتیں کر رہا تھا جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس شادی سے خوش نہیں۔ اُس نے اور باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا — "میں اس کے ساتھ شادی نہیں کروں گا کیونکہ یہ پہلے انکار کر چکی ہے۔"

"میں تو ایسی جرأت نہیں کر سکتا کہ نکاح کے رجسٹر سے اس کے انگوٹھے کا نشان مٹا دوں" — شاہ نے کہا — "یہ انتظام جنّوں نے کیا ہے۔ تمہیں گھر سے یہاں تک دھکیل کر لانے والے وہ دو جنّ تھے جو زینب کو چاہتے ہیں۔ اُنہوں نے مجھے پہلے ہی کہا تھا کہ وہ زینب کو بیوہ نہیں رہنے دیں گے۔ وہ پہلے اسے یہاں لے آئے پھر تمہیں لے آئے۔ یہ نکاح کا رجسٹر مسجد میں پیش امام کے پاس ہوتا ہے۔ میں تو رجسٹر لینے نہیں گیا تھا۔ جنّوں نے لا کر میرے کاغذوں کے نیچے رکھ دیا اور اس کا انگوٹھا لگ گیا۔ اب تم بھی انگوٹھا لگاؤ ورنہ مارے جاؤ گے۔"

مختصر یہ کہ شاہ نے دھوکہ دہی کا عجیب و غریب جرم کیا۔ میں جو کچھ سمجھ سکا وہ یہی تھا کہ اختر حسین اور شاہ نے یہ جُرم پہلے پلان بنا کر کیا تھا۔ زینب پر شاہ صاحب کا اتنا زیادہ اثر اور جنّوں کا اتنا زیادہ خوف تھا کہ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ شاہ نے اُسے یہ کہہ کر اور زیادہ خوفزدہ کر دیا کہ اگر اُس نے اس شادی کے خلاف کوئی بات کی یا اختر حسین کے ساتھ کوئی بدتمیزی کی تو جنّ اُسے بڑی ہی بھیانک سزا دیں گے۔

وہ خاموشی سے اختر حسین کے ساتھ چلی گئی۔ اختر حسین نے گاؤں میں اعلان کر دیا کہ شاہ صاحب نے اُس کا نکاح زینب کے ساتھ پڑھا دیا ہے۔ یہ شادی نہ اختر حسین کی پہلی تھی نہ زینب کی، اس لیے وہ اُودھم بپا نہ کیا گیا جو پہلی شادی پر کیا جاتا ہے۔

اختر حسین اور اس کے خاندان کا اتنا رعب اور دبدبہ تھا کہ گاؤں ہر کسی نے بھی باز پرس نہ کی کہ یہ شادی کس طرح ہو گئی ہے۔ سب سے زیادہ اعتراض زینب کے ماں باپ کو ہو سکتا تھا۔ اُن سے کسی نے پُوچھا

ہی نہیں تھا لیکن وہ دونوں خوش ہوئے۔ وہ تو اللہ سے دعائیں مانگتے رہتے تھے کہ ان کی جوان بیٹی کہیں بیاہی جائے۔ زینب چپ تھی۔ اُسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔

تین چار دنوں بعد مردانگی کے جوش میں آکر اختر نے زینب سے کہا — "میں نے تم سے کہا تھا ناکہ شادی تمہارے ساتھ ہی کروں گا۔ بتاؤ کی ہے یا نہیں؟ اب بھاگ کر کہاں جاؤ گی؟ نکاح کے رجسٹر پر تمہارا انگوٹھا لگ چکا ہے۔"

زینب سمجھ گئی کہ اُس کے ساتھ دھوکہ ہُوا ہے۔ اُس نے پہلی بغاوت یہ کی کہ خانقاہ پر دیا جلانا ترک کردیا۔ صرف خاوند کی قبر پر ہر جمعرات دیا جلاتی رہی۔

ایک روز اختر حسین نے اُسے کہا کہ وہ خاوند کی قبر پر جانا چھوڑ دے۔

زینب نے اطمینان اور تحمّل سے جواب دیا — "تم میرے جسم کے مالک ہو اور میرا خاوند وہ ہے جو قبر میں سویا ہُوا ہے۔"

زینب نے مجھے بتایا کہ وہ پتھر بن گئی۔ اختر حسین کی خدمت کرتی اور بیویوں کے سارے فرائض پورے کرتی تھی لیکن بولتی نہیں تھی۔ اس پر خاموشی طاری ہوگئی۔ اختر حسین اُسے ہنستا کھیلتا دیکھنا چاہتا تھا۔ اُس نے ایک روز تنگ آکر زینب کو مارا پیٹا مگر زینب بے جان لکڑی کی طرح کھڑی رہی اور مار کھاتی رہی۔

اختر حسین غصّے سے پرے چلا گیا تو وہ بھی پرے چلی گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھی نہیں آتے تھے۔ وہ بے حس ہوگئی تھی۔ اختر حسین اس قدر پریشان ہُوا کہ اُس نے زینب کی منّت سماجت شروع کردی۔ وہ اختر جس سے سب ڈرتے تھے ایک عورت کے آگے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اُس کی جوانمردی اور دلیری کو ایک عورت نے اپنی خاموشی میں ختم کردیا۔

وہ صرف ایک بار بولی۔ اُس روز اختر حسین نے اُس کی بہت منّت سماجت کی تھی کہ وہ کچھ تو بولا کرے — "تم جو کہو گی کروں گا۔ مجھے دل سے قبول کرلو"— اس نے زینب سے کہا۔

زینب نے کہا — "مجھے طلاق دے دو۔"

اختر حسین کے آنسو نکل آئے۔

ایک سال گزر گیا اور زینب نے اختر حسین کے پہلے بچے کو جنم دیا۔ اُس روز پہلی بار زینب روئی اور بہت دیر تک روتی رہی۔ اُس نے بچّے سے پیار نہ کیا۔ پندرہ دن گذر گئے۔ اُسے غذا بڑی اچھی دی جا رہی تھی جس سے اس کے جسم میں ذرا جلدی جان آگئی۔ آدھی رات کے بعد اُس نے دیکھا کہ گھر کے تمام افراد گہری نیند سو گئے ہیں تو وہ اٹھی اور سوتے ہوئے بچّے کو اُٹھایا۔ وہ شاہ کے گھر کی طرف گئی اور سوتے ہوئے بچّے کو شاہ کے دروازے کے سامنے رکھ کر تھانے کی طرف چل پڑی۔ اُسے کسی جنّ سے ڈر نہ لگا۔ تھانہ بہت دُور تھا۔ وہ تھانیدار کو رپورٹ دینے چلی تھی کہ اس کے ساتھ دھوکہ ہُوا ہے اور وہ اختر حسین کی شرعی بیوی نہیں ہے۔ وہ اس سے پہلے اس لیے گھر سے نہ بھاگی کہ اُسے شاہ اور اُس کے جنّوں سے خوف آتا تھا۔ پھر اُس کے پیٹ میں بچّہ پرورش پانے لگا۔ اختر حسین کی باتوں سے اُس کے دل سے شاہ اور جنّوں کا خوف نکل گیا اور بعد میں بچّہ پیدا ہُوا تو وہ بھاگ اُٹھی۔

اُس کے جسم میں جان تو عود کر آئی تھی لیکن بچّے کی پیدائش کو ابھی پندرہ دن گزرے تھے۔ ہمارے گاؤں کے قریب آکر وہ گر پڑی۔ اُس نے اٹھنے اور چلنے کی کوشش کی مگر وہ بے ہوش ہوگئی۔

اُسے ہم اپنے گھر بے ہوشی کی حالت میں لائے تھے۔ اب یہ میرا فرض تھا کہ اس کی مدد کی جائے۔ میں بھی اسی دیہات کے رسم و رواج اور توہم پرستی میں جنا پلا تھا لیکن فوج کی نوکری اور جنگ نے دماغ کے بند دروازے کھول دیئے تھے۔ میں نے انگریزوں کے ساتھ انٹیلی جنس

میں بھی کام کیا تھا۔ ہم نے ہندوستان کے ایسے ایسے کھنڈروں کی بھی تلاشی لی تھی جن کے متعلق مشہور تھا کہ ان میں جنّ بھوت رہتے ہیں اور جو اندر جاتا ہے وہ باہر نہیں آسکتا۔ انگریزوں نے بھی مجھے حقیقی زندگی دکھا دی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ عورت بہت بڑے فراڈ کا شکار ہوئی ہے۔ میری نظر میں یہ شاہ اور جنّ بھوت کوئی معنی نہیں رکھتے تھے۔

میں بتا چکا ہوں کہ تھانیدار سکھ اور اس کا اسسٹنٹ سب انسپکٹر ہندو تھا۔ وہ اس خوبصورت عورت کو خراب کر سکتے تھے۔ اس کی کبھی مدد نہ کرتے۔ اختر حسین مُنہ مانگی رشوت دینے کے قابل تھا۔ اس کے علاوہ سکھ اور ہندو مسلمانوں کے کسی شاہ صاحب پر کبھی ہاتھ نہ ڈالتے۔ اس عورت کے لیے بہر حال ذلّت اور بے انصافی تھی۔

میں نے اپنی برادری کے سرکردہ حضرات کو اور لٹھ باز جوانوں کو بُلا کر زینب کی واردات سُنائی اور انہیں کہا کہ اگر ہم اس مظلوم عورت کو یہ کہہ کر گاؤں سے رخصت کر دیں کہ ہم اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تو یہ غیر اسلامی فعل ہوگا۔ میں نے اسے بہن کہا ہے۔ اب بھائی اپنی بہن کو مدد کے بغیر جانے نہیں دے گا۔ میں اسے جالندھر انگریز افسروں کے پاس لے جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے اس کے جعلی خاوند (اختر حسین) سے آمنا سامنا ہو جائے۔ اس صورت میں وہ ہم پر حملہ کرے گا۔ اس کی برادری میں بہت سے مرد ہیں۔ خونریز لڑائی ہونے کا خطرہ ہے۔ مجھے تم سب کی مدد کی ضرورت ہے۔

میں نے انہیں اتنا بھڑکا دیا تھا کہ وہ میرا ساتھ دینے کو تیار ہو گئے۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ پولیس اس عورت کی مدد کرنے کو تیار نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ رشوت اور طاقت اختر حسین اور شاہ صاحب کے پاس تھی۔ میں اِن دھوکہ بازوں کو سزا دلانے کا پکّا ارادہ کر چکا تھا۔ اس کا میں نے طریقہ سوچ لیا تھا۔ میں نے اُسے دوسرے دن جالندھر لے جانے کا پروگرام بنایا۔ اُسے میں نے اچھی طرح سمجھا دیا کہ میں اُسے

کہاں لے جاؤں گا اور وہ کیا کہے گی۔

اُس روز اُسے اپنے گھر میں چُھپائے رکھا۔ شام سے پہلے پہلے یہ خبر ہمارے گاؤں میں بھی پہنچ گئی کہ فلاں گاؤں کی ایک عورت اپنا نوزائیدہ بچّہ ایک شاہ صاحب کے دروازے پر رکھ کر کہیں غائب ہو گئی ہے۔

میں نے یکّے کا انتظام کر لیا تھا۔ سحر ابھی اندھیری تھی جب میں نے زینب کو جگایا اور اُسے یکّے میں بٹھایا۔ میرے علاوہ یکّے میں چار اور آدمی تھے۔ چھ سات آدمی گھوڑوں پر ساتھ تھے اور دو سائیکلوں پر بھی تھے۔ ان سب کے پاس لاٹھیاں اور کلہاڑیاں تھیں۔ میں زینب کو جالندھر چھاؤنی کے سٹیشن کمانڈر کے پاس لے جا رہا تھا۔ وہ میجر لوکہارٹ نام کا انگریز افسر تھا۔ وہ ایک ٹانگ سے کچھ معذور تھا اس لیے اُسے صرف چھاؤنی کی کوئی دفتری ڈیوٹی دی گئی تھی۔ اُس کے ساتھ میری اچھی خاصی ملاقات تھی۔ ڈیڑھ دو سال پہلے وہ انبالہ چھاؤنی میں تھا۔ وہاں ایک کیس کی تفتیش کے سلسلے میں میں اس سے ملا تھا۔ یہ جاسوسی کا کیس تھا۔

ہمارا یکّہ جب جالندھر چھاؤنی میں داخل ہُوا تو سورج طلوع ہو رہا تھا۔ میں یکّے کو میجر لوکہارٹ کے دفتر کے سامنے لے گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ دفتر میں آگیا۔ مجھے سویلین کپڑوں میں دیکھ کر وہ سمجھا کہ میں انٹیلی جنس ڈیوٹی پر ہوں۔ بڑے اچھے طریقے سے بولا — "وَیل صوبیدار صاحب! کوئی اور گڑبڑ ہو گیا؟"

میں اُس کے ساتھ ہی اُس کے دفتر میں چلا گیا اور اسے بتایا کہ میں چھٹی پر ہوں اور سول کا ایک کیس لایا ہوں۔ اُسے ساری واردات سُنا دی۔

اُس نے کہا کہ یہ سول پولیس کا کیس ہے، اس عورت سے کہو کہ سول پولیس کے پاس جاتے۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں اُسے براہِ راست پولیس کے پاس جانے سے کیوں روک رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ڈپٹی کمشنر صاحب اس کیس میں دل چسپی لیں ورنہ ان مجرموں کو کبھی سزا نہیں

ملے گی اور وہ قانون اپنے ہاتھ میں لے کر اس عورت کو سزا دیں گے۔

میجر لوکھارٹ میری بات سمجھ گیا۔ وہ شاہ اور اختر حسین کے جُرم پر حیران بھی ہُوا اور ہنسا بھی۔ اُس نے کہا ــــ "تم مسلمان لوگ افریقہ کے حبشیوں سے کم نہیں۔ وہاں کے لوگ بھی ایک آدمی کو خدا کا ایلچی بنا کر اُسی کے آگے سجدے کرتے رہتے ہیں۔"

اُس کی اس رائے نے مجھے بہت شرمسار کیا۔

اُس کا اس جرم کے ساتھ یا کسی کے بھی جُرم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ سٹیشن کمانڈر کی ڈیوٹی کچھ اور تھی۔ میں اس کی سفارش استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اُس کے دل میں زینب کی ہمدردی اور مجرموں کے خلاف نفرت پیدا ہوگئی۔ اُس نے اُسی وقت ڈپٹی کمشنر کو ٹیلی فون کیا اور اُسے میرے متعلق اور میری سروس کے متعلق بہت کچھ بتا کر زینب کی مظلومیت کا مختصر سا ذکر کیا اور پُرزور سفارش کی کہ اس فراڈ کی پُوری تحقیقات ہونی چاہیئے۔ میجر لوکھارٹ نے اپنی طرف سے ڈپٹی کمشنر کو یہ بھی کہا کہ اس قسم کے فریب کار پیر اور شاہ وغیرہ اُن فوجیوں کے لواحقین کے ساتھ بھی نوسربازی اور فریب کاری کرتے رہتے ہیں جو جنگ کے دُور دراز محاذوں پر گئے ہوئے ہیں اور لڑ رہے ہیں۔

اُس نے مجھے ڈپٹی کمشنر کے پاس بھیج دیا۔ میں زینب اور اپنے باڈی گارڈوں کو ساتھ لے کر ڈپٹی کمشنر کے دفتر گیا۔ وہ انگریز تھا۔ میری اطلاع ملتے ہی اُس نے مجھے اندر بلا لیا۔ اُس میں پاکستانی افسروں والی رعونت نہیں تھی۔ حالانکہ، پُرانے لوگ جانتے ہیں کہ ڈپٹی کمشنر کو لوگ برطانیہ کے شہنشاہِ معظم سے زیادہ بڑا آدمی سمجھتے تھے۔ اُس کی پاور ہی ایسی ہوتی تھی۔ اُس نے زینب کو بھی اندر بلا لیا اور اُسے کہا کہ وہ ساری بات سُنائے۔ زینب نے کم و بیش ڈیڑھ گھنٹہ صرف کرکے اپنی کہانی سُنائی جو اس انگریز ڈپٹی کمشنر نے پُوری توجہ سے سُنی۔ اُس نے مجھے کہا ــــ "نوزائیدہ بچے کو اس بے دردی سے باہر پھینکنا سنگین جُرم ہے

لیکن اس عورت کے ساتھ جو دھوکہ ہُوا ہے اس کے سامنے اس کا یہ جُرم معمولی سا لگتا ہے۔"

اُس نے پولیس کے کسی بڑے افسر کو فون کیا اور اُسے کہا کہ وہ فوری طور پر ایک گاؤں میں چھاپہ مارنے اور ایک جُرم کی تفتیش کا انتظام کر دے۔ میں نے ڈپٹی کمشنر کو بتایا کہ اختر حسین میرے خلاف شدید انتقامی کارروائی کرے گا۔ اُس نے مجھے تسلّی دی کہ وہ اس کا انتظام بھی کر دے گا۔

مجھے اپنے گاؤں جانے کے لیے کہا گیا۔ زینب کو وہیں رکھا گیا۔ میں اپنے باڈی گارڈوں کے ساتھ اپنے گاؤں چلا گیا۔ سورج غروب ہونے سے بہت پہلے میرے گاؤں کے قریب سے چار گھوڑے گزرے۔ ایک پر ایک انگریز پولیس افسر سوار تھا۔ دو پر دو ہندوستانی پولیس افسر تھے اور تیسرے پر کوئی سویلین کپڑوں والا تھا۔ کانسٹیبلوں کی گارد دو یکّوں پر جا رہی تھی۔ ایک یکّے میں اگلی سیٹ پر زینب بیٹھی تھی۔

دوسری صبح مجھے اختر حسین کے گاؤں بلایا گیا۔ پولیس رات بھر وہیں رہی تھی۔ مجھ سے انگریز افسر نے زینب کے متعلق پوچھا کہ وہ مجھے کس طرح ملی تھی۔ میں نے اُسے بتا دیا۔ تین آدمیوں کو میں نے ہتھکڑیوں میں دیکھا۔ مجھے بتایا گیا کہ ان میں سے ایک اختر حسین ہے، دوسرا شاہ صاحب اور تیسرا گاؤں کی مسجد کا مولوی جس نے نکاح کا رجسٹر شاہ کو دیا تھا۔ نکاح رجسٹر صرف مولوی کے پاس رہنا چاہیئے تھا۔

رات ہی رات پولیس نے تفتیش مکمل کر لی تھی۔ مجرموں کو پولیس ساتھ لے گئی۔ مجھے بھی دو تین بار جانا پڑا اور پھر مقدمہ عدالت میں گیا۔ مجسٹریٹ نے جرائم کی سنگینی دیکھ کر کیس سیشن سپرد کر دیا جہاں سے جناب شاہ صاحب کو دھوکہ دہی کے جُرم میں اور قانونی دستاویز (نکاح کے رجسٹر) میں غلط اندراج کرنے کی پاداش میں مجموعی طور پر پانچ سال سزائے قید دی گئی۔ اختر حسین کو دھوکہ دہی، حبسِ بے جا اور جبری آبروریزی کے جرائم میں گیارہ سال سزائے قید ملی اور مولوی کو چھ ماہ سزائے قید

دی گئی۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے یہ جانتے ہوئے کہ نکاح رجسٹر کا غلط استعمال ہوگا یہ قانونی دستاویز شاہ اور اختر حسین کو دے دی۔

شاہ اور مولوی کو اختر حسین نے اس جرم کے لیے بہت سی رقم دی تھی اور جنوں کا ڈرامہ شاہ کے دماغ کی اختراع تھا۔ اس نے اختر حسین کو بتا دیا تھا کہ وہ فلاں دن اور فلاں وقت اس کے گھر آجائے اور شاہ زینب کو گھر میں بلا کر انگوٹھا لگا لے گا۔ اس کا ڈرامہ کامیاب رہا جو دراصل زینب کی سادگی اور خوفزدگی کا نتیجہ تھا۔

شاہ نے عدالت میں اپنی صفائی میں اس رجسٹر کا حوالہ دیا اور کہا تھا کہ اختر اور زینب کی شادی باقاعدہ ہوئی ہے۔ اس کے وکیل نے زینب کی ماں کو اور اس کے باپ کو عدالت میں پیش کیا تھا جنہوں نے یہ بیان دیئے کہ یہ شادی ان کی اجازت سے ہوئی تھی۔ نکاح کے رجسٹر پر دو گواہوں کے بھی انگوٹھے تھے۔ یہ گواہ بھی پیش کیے گئے۔ ظاہر ہے کہ زینب کے والدین کو رقم یا دھمکی یا دونوں کے زور پر عدالت میں لایا گیا تھا۔ گواہ اختر کے قریبی رشتہ دار تھے۔ سرکاری وکیل نے ان سب کو جھٹلا دیا۔ اس نے جرح میں کھرا کھوٹا الگ الگ کر دیا۔

دلچسپ اور عجیب بیان اختر حسین کا تھا۔ اس نے بھی اپنی صفائی میں جھوٹ بولے مگر سرکاری وکیل نے جب جرح شروع کی تو اس کی حالت بگڑ گئی۔ اس روز عدالت میں تمام وقت اسی پر جرح ہوتی رہی۔ آخر اس کی مردانگی ٹوٹ پھوٹ گئی۔ اس نے سرکاری وکیل کے ایک سوال کے جواب میں غیر متوقع طور پر جرم کا اعتراف کر لیا۔ اس نے کہا ”میں دراصل زینب کے ساتھ شادی کر کے اس کی زمین پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ مجھے امید تھی کہ میں اشارہ کروں گا تو یہ میرے ساتھ شادی کرلے گی لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ پھر اس نے ایسا رویہ اختیار کر لیا کہ میرے دل میں اس کی محبت اور قدر پیدا ہو گئی۔ میں نے

اپنے آپ پر قابو پانے کی بہت کوشش کی لیکن زینب میرے دل میں اتر گئی تھی۔ میں مجبور ہو گیا اور شاہ صاحب سے ذکر کیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ کتنی رقم لیں گے۔ میں نے یہ رقم دے دی۔ پھر انہوں نے مجھ سے مولوی صاحب کے لیے کچھ رقم مانگی۔ میں نے وہ بھی دے دی۔ اس کے فوراً بعد یہ کھیل کھیلا گیا ... میرے دل سے زینب کی زمین پر قبضہ کرنے کا ارادہ نکل چکا تھا۔ میں تو یہ کہتا تھا کہ یہ میری ساری زمین اپنے نام لکھوا لے اور مجھے محبت سے قبول کر لے لیکن یہ صرف بیوی بنی رہی۔ اس نے میری محبت قبول نہ کی۔“

سیشن جج نے بچے کے متعلق فیصلے میں لکھا کہ یہ بچہ شادی کے بغیر پیدا ہوا ہے اور یہ اختر حسین کے جرم کی پیداوار ہے اس لیے اس کی پرورش کا ذمہ دار اختر ہے زینب نہیں۔ اختر اور شاہ پر جرمانہ بھی کیا گیا تھا۔ مجھے رقم یاد نہیں رہی۔ جج نے لکھا کہ جرمانے کی رقم زینب کو دی جائے۔ عدم ادائیگی کی صورت میں دو دو سال مزید قید۔ بعد میں پتہ چلا تھا کہ اختر نے جرمانہ ادا کر دیا تھا اور شاہ صاحب نے دو سال مزید قید قبول کر لی تھی۔

اس کے دو سوا دو سال بعد (اگست ۱۹۴۷ء میں) ہم ہجرت کر کے پاکستان آگئے تھے۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ اس گھناؤنی واردات کے بعد بھی اس خانقاہ پر لوگ دیئے جلاتے اور سجدے کرتے رہے تھے؟



میں قتل کرنے چلا تھا

وہ آٹھ نو سال سے کراچی میں رہتا ہے۔ کسی کی ٹیکسی چلاتا ہے۔ اس کا نام قادرالحق ہے۔ عمر پچاس اور ساٹھ کے درمیان ہے۔ اُس نے ہماری کالونی میں ایک کوارٹر کرائے پر لے رکھا ہے۔ اس کا ایک بیٹا جوان ہے۔ باقی بچّے چھوٹے ہیں اور اُس کی بیوی بنگالی ہے۔ ہم نے قادرالحق اور اس کے خاندان کی طرف کبھی توجہ نہیں دی تھی۔ کراچی میں یہی دستور رہے کہ پڑوسی ایک دوسرے کی طرف توجہ نہیں دیا کرتے۔ ہم تو اس کے نام سے بھی واقف نہیں تھے۔ اتنا ہی معلوم تھا کہ وہ ٹیکسی ڈرائیور رہے۔

ایک شام میں اپنے تین دوستوں کے ساتھ کلفٹن گیا۔ ہم سب نوجوان ہیں۔ چھیڑ چھاڑ اور شرارت سے ہم باز نہیں رہ سکتے۔ ہم بس سے کلفٹن اُترے تو ایک ٹیکسی آکر رُکی۔ اس میں سے دو لڑکیاں نکلیں۔ ٹیکسی ڈرائیور قادرالحق تھا۔ میرے ایک دوست نے لڑکیوں پر ایک فقرہ چُست کیا۔ دوسرے نے ان کے بالکل قریب جاکر کچھ کہہ دیا۔ لڑکیاں پنجاب کی رہنے والی تھیں۔ شرما کر وہاں سے کھسک جانے کی بجائے انہوں نے میرے دوستوں پر جوابی حملہ کر دیا۔ وہ دونوں ہم چاروں سے زیادہ صحت مند اور توانا تھیں۔ انہوں نے پنجابی زبان میں ہمیں ایسی سنائیں کہ ہمارا پسینہ نکل آیا۔ اگر وہ ہم پر ٹوٹ پڑتیں تو ہم چاروں دُبلے پتلے سے لڑکے ان سے پٹائی کرا لیتے، ان کا مقابلہ نہ کر سکتے۔ ہم چونکہ مجرم تھے اس لیے بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

قادرالحق ٹیکسی سے نکل آیا اور ہم سے کہا — "تم چاروں ایک ایک تھپّڑ نہیں سہہ سکتے۔ فوراً بھاگو یہاں سے" — اور ہم وہاں سے بھاگ گئے۔

دوسرے تیسرے دن کا ذکر ہے کہ میں علی الصبح ناشتے کا سامان لینے کے لیے گھر سے نکلا تو قادر الحق اپنے کوارٹر سے نکلا۔ اُس نے مجھے پہچان لیا مُسکرا کر مجھے سلام کیا۔ ہاتھ ملایا۔

"بیٹا!" اُس نے کہا "تم میرے پڑوسی ہو۔ میرے بچّے بھی ہو۔ اگر مجھے موقعہ دو تو کچھ باتیں کرنا چاہتا ہُوں۔ تم شاید کالج میں پڑھتے ہو۔ میں اپنی ٹیکسی کا نمبر پہچاننے کے سوا اور کچھ بھی نہیں پڑھ سکتا۔ میری باتیں تمہیں اچھی نہیں لگیں گی لیکن میرے دل پر ایک بوجھ ہے جو تمہارے اُوپر رکھنا چاہتا ہُوں۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں نے حال ہی میں بی۔ اے کا امتحان دیا ہے اور وہ اَن پڑھ آدمی ہے۔ مجھے اُس کی بات پر دھیان نہیں دینا چاہیئے تھا لیکن دو وجوہات تھیں جن سے مجبور ہو کر میں نے اُسے کہا کہ وہ جب کبھی فارغ ہو مجھے بلالے۔ ایک وجہ یہ تھی کہ مجھ میں غرور اور تکبّر نہیں اور دوسری یہ کہ اُس نے ایسے عجیب انداز سے بات کی کہ میں اسے ٹال نہ سکا۔ اُس کے لہجے میں پیار تھا۔ وہ دلچسپ آدمی معلوم ہوتا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے نصیحت کرے گا کہ لڑکیوں کو نہیں چھیڑنا چاہیئے۔

پھر اس کے ساتھ میری بڑی لمبی ملاقات ہوئی۔ بات وہی نکلی۔ وہ مجھے نصیحت کرنا چاہتا تھا کہ لڑکیوں کو نہیں چھیڑنا چاہیئے لیکن اُس نے جس سلیقے سے بات کی اس نے مجھے بہت متاثر کیا۔

"ان دو لڑکیوں کو دیکھ کر تمہیں اپنی بہن یاد نہیں آئی تھی؟" اُس نے مجھ سے پوچھا "مجھے معلوم ہے کہ تمہاری ایک بہن جوان ہے۔ تم لوگوں کی بہنوں کو چھیڑتے ہو اور اُن کا پیچھا کرتے ہو اور لوگ تمہاری بہن کو چھیڑتے اور اس کا پیچھا کرتے ہیں۔ وہ تو پنجاب کی لڑکیاں تھیں۔ اگر میں درمیان میں نہ آجاتا تو وہ تمہاری مرمّت کر دیتیں۔ تمہاری بہن میں اتنی دلیری نہیں ہے" یہ کہہ کر وہ چُپ ہو گیا اور اُس نے ایسی بات کہی جس نے میرا خُون گرما دیا۔ اُس نے کہا "تمہاری بہن کو کوئی لونڈا آسانی سے پھانس بھی سکتا ہے۔ اگر ایسا

ہو گیا تو تم کیا کرو گے؟"

میری حالت ایسی ہو گئی کہ میرے مُنہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ دماغ میں کوئی جواب آتا ہی نہیں تھا۔

"میں تمہیں شرمندہ نہیں کرنا چاہتا" اُس نے کہا "دو باتیں کہوں گا۔ ایک یہ کہ ہر لڑکی کو اپنی بہن سمجھو اور دوسری بات ہمیشہ یاد رکھو کہ خدا نے ہر انسان کو نیک کاموں کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہ خدا کی مرضی ہے۔ معلوم نہیں خدا تم سے کون سا نیک کام کرانا چاہتا ہے لیکن تم نے اپنا دماغ گناہوں کی طرف لگا دیا ہے۔ خدا ناراض ہو کر تمہیں گناہوں میں ڈبو دے گا پھر تم نیکی سے محروم ہو جاؤ گے" یہ کہہ کر اُس نے عجیب سی بات کہی۔ کہنے لگا "اس شہر میں نہ کوئی بچھّو نظر آتا ہے نہ کوئی سانپ جو گناہگاروں کو گناہوں سے روک لے۔"

"بچھّو اور سانپ؟" میں نے حیران سا ہو کر پوچھا "یہ لوگوں کو گناہوں سے کس طرح روک سکتے ہیں؟"

"جس طرح مجھے روکا تھا" اُس نے کہا اور ایک کہانی سُنا دی جو اس کی آپ بیتی ہے۔ یہ میں آپ کو اُسی طرح سُنا دیتا ہوں جس طرح اُس نے مجھے سنائی تھی۔ اس میں سے غیر ضروری باتیں حذف کر رہا ہوں۔

میں آسام کے ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ میری عمر چودہ پندرہ سال ہوئی تو میری ماں مر گئی۔ باپ نے ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ شادی کر لی۔ آسام والوں کے رنگ گورے چٹے ہوتے ہیں۔ یہ لڑکی نوجوان تھی اور رنگ کی وجہ سے خوبصورت بھی تھی۔ اُس نے میرے باپ کو اپنا غلام بنا لیا۔ میرا باپ اُس وقت بہت بوڑھا نہیں تھا۔ اُس کی عمر شاید چالیس سال نہیں ہوئی تھی۔ ہم دیہاتی لوگ تھے۔ کھیتی باڑی بھی کرتے اور محنت مزدوری بھی کرتے تھے۔ عورتوں کو وہاں مردوں کے ساتھ بہت کام کرنا پڑتا تھا۔ میری سوتیلی ماں شہزادی بن کر آئی۔ وہ کوئی کام نہیں کرتی تھی۔ وہ اپنے کام مجھ سے کراتی تھی۔ پانی بھی مجھے بھر کر لانا پڑتا تھا۔ یہ کام عورتوں کا ہوتا تھا۔ وہ چشمے، ندی یا کنوئیں سے پانی لایا کرتی تھیں۔ پھر اس جوان سوتیلی ماں نے

کپڑے بھی مجھ سے دھلوانے شروع کر دیئے۔

میں اُس سے تنگ آگیا اور ایک روز کہہ دیا کہ اگر تم مجھ سے اپنا کام کرانا چاہتی ہو تو میرے باپ سے کہو کہ وہ مجھے دوسرے کام نہ بتایا کرے۔

اس پر ہم دونوں میں ناراضگی شروع ہوگئی۔ اُس نے میرے باپ کو میرے خلاف کر دیا۔ باپ پر اُس کا اثر تھا۔ باپ بھی میرے خلاف ہوگیا۔ میری اپنی ماں مجھ سے بہت پیار کرتی تھی۔ میں اُس کا اکیلا بچّہ تھا۔ وہ مرگئی تو میں پیار کا پیاسا ہوگیا۔ ماں کی موت کا دل میں بہت غم تھا۔ باپ نے مجھے پیار دینے کی بجائے میرے ساتھ بُرا سلوک شروع کر دیا۔ میں نے بغاوت شروع کر دی۔ باپ نے مجھے مارا پیٹا اور ایک روز میں گھر سے نکل گیا۔

میں نے یہ سوچا تھا کہ اگر محنت مزدوری ہی کرنی ہے تو اپنی مرضی سے کروں گا اور پیسے کماؤں گا۔ اس لڑکی کی غلامی اور باپ کی مار پٹائی کو میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

میں شیلانگ چلا گیا جو آسام کا ایک بڑا شہر ہے۔ میں کسی امیر گھرانے کا لڑکا نہیں تھا جسے کوئی تکلیف ہوتی۔ تین چار دن ایسے ہی گزرے۔ دن کو کچھ ملا تو کھا لیا اور رات کو کہیں بھی آسمان تلے لیٹے اور سو گئے۔

ایک روز ایک انگریز فوجی افسر کا سامان اٹھانے کا موقعہ مل گیا۔ وہ اردو بولتا تھا اور ہم مسلمان ہونے کی وجہ سے اپنی زبان کے علاوہ پٹھانوں کی طرح اردو بول لیتے تھے۔ تم آج میرا رنگ دیکھ رہے ہو۔ پندرہ سولہ سال کی عمر میں میرا رنگ اس سے زیادہ گورا تھا۔ میں نے انگریز کا سامان اُس کے بنگلے تک پہنچایا تو اُس نے پوچھا کہ میں یہی (قلیوں کا) کام کرتا ہوں یا کسی کے گھر کبھی نوکری بھی کی ہے۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں گھر سے سوتیلی ماں اور اپنے باپ کے ظلم سے بھاگا ہُوا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ کہیں نوکری مل جائے۔

اُسے شاید میرا رنگ روپ پسند آگیا تھا یا اُسے واقعی نوکر کی ضرورت تھی۔ اُس نے مجھے جھاڑ پونچھ اور بوٹ پالش کے لیے اپنے پاس رکھ لیا۔ اس کا ایک اردلی بھی تھا جو ہندوستان کے کسی علاقے کا رہنے والا تھا اور اس

کا ایک خانساماں بھی تھا۔ ان دونوں نے مجھے سمجھا دیا کہ انگریزوں کی نوکری کس طرح کی جاتی ہے۔ انہوں نے بُوٹ پالش کرنے کا طریقہ بھی بتا دیا۔ جھاڑ پونچھ بھی سکھا دی۔ مجھے یہ نوکری پسند آگئی۔

اس بنگلے کے قریب تین چار اور بنگلے تھے۔ ان سب میں انگریز رہتے تھے۔ ان کے بھی نوکر، اردلی اور خانسامے تھے۔ ان لوگوں کو جب فرصت ہوتی تو سب ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے اور خوش گپیوں سے دل بہلاتے تھے۔ وہ بہت گندی اور بُری باتیں کرتے تھے۔ تاش بھی کھیلتے تھے۔ کبھی کبھی وہ اپنے صاحب لوگوں کی بوتلوں سے تھوڑی تھوڑی شراب چُرا لاتے اور اسے وہاں کی بنی ہوئی دیسی شراب میں ملا کر پیتے تھے۔

میں نے پہلے پہل شراب نہیں پی کیونکہ میں مسلمان تھا لیکن ان میں بڑی عمر کے جو آدمی تھے، وہ کہتے تھے کہ ہم بھی مسلمان ہیں۔ تم کوئی اعلیٰ قسم کے مسلمان تو نہیں، پیو۔ میں نے بھی پینی شروع کر دی۔

یہ لوگ جُوا بھی کھیلتے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی جُوئے میں شامل کر لیا۔ مجھے پہلی تنخواہ ملی۔ وہ انہوں نے جیت لی۔ مجھے بہت غصّہ آیا۔ ان میں سے ایک سے کچھ پیسے اُدھار لیے۔ میں نے دو بازیاں جیتیں اور اُدھار اُتار دیا۔ اس جیت ہار نے مجھے جوئے کا عادی بنا دیا۔ نوکری کو ابھی دو مہینے پورے ہوئے تھے۔ دوسرے مہینے کی تنخواہ ملی تو وہ ایک ہی رات میں ہار دی۔ اُدھار لیا تو یہ رقم بھی ہار دی۔ مجھے اور اُدھار کسی نے نہ دیا۔

تم نہیں جانتے کہ جُوئے باز جب ہار جاتا ہے تو اُس کا کیا حال ہوتا ہے۔ میری عمر ابھی کچّی تھی۔ میرا تو بہت بُرا حال ہُوا۔ میں نے کہا کہ ہاری ہوئی رقم ضرور واپس لوں گا لیکن میرے پاس ایک پیسہ نہیں رہا تھا۔ میرا صاحب اکیلا رہتا تھا اس لیے سارے پیسے اپنی جیب میں رکھتا تھا۔ ایک روز اُس نے کچھ پیسے جو نوٹ تھے الماری میں رکھے۔ تھوڑی دیر بعد اُسے کہیں سے بلاوا آگیا اور وہ دوڑتا ہُوا باہر چلا گیا۔

اُس وقت جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ اُدھر آسام اور برما میں کوئی جنگ

نہیں تھی۔ میرا صاحب چلا گیا تو مجھے یاد آ گیا کہ اُس نے کپڑوں والی الماری میں پیسے رکھے تھے۔ میں نے اچھا بُرا بالکل نہیں سوچا۔ میں نے الماری کا ایک کواڑ ذرا سا کھولا۔ نوٹ پڑے نظر آئے۔ پُوری الماری کھولے بغیر میں نے اندر ہاتھ ڈالا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی چوری نہیں کی تھی۔ میرا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ جوں ہی ہاتھ نوٹوں تک پہنچا میری درمیانی انگلی میں سوئی سی اُتر گئی۔ اس قدر زیادہ درد ہُوا جو میں بیان نہیں کرسکتا۔ میں جان گیا کہ یہ سوئی نہیں کسی زہریلی چیز کا ڈنک ہے۔

میں نے تیزی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ الماری پوری کھول کر دیکھا۔ وہاں ایک بچھو اِدھر اُدھر دوڑتا پھر رہا تھا۔ انگریزوں کے یہ بنگلے شہر سے کچھ دُور جنگل کے علاقے میں تھے۔ وہاں سانپ اور بچھو اکثر نظر آتے تھے۔ جس بچھو نے مجھے کاٹا وہ جامنی رنگ کا زہریلا بچھو تھا۔ میری چیخیں نکل گئیں۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ زہر میرے بازو کے اندر جا رہا ہے۔ نوٹ وہیں پڑے رہے۔

میری چیخیں سُن کر اردلی اور خانساماں دوڑے آئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ الماری میں کپڑے رکھتے ہوئے بچھو نے کاٹ لیا ہے۔ اردلی نے الماری میں دیکھا اور اُس نے بچھو کو مار دیا۔ خانساماں نے ایک بلیڈ سے وہ جگہ ذرا کاٹ دی جہاں بچھو نے ڈنک مارا تھا۔ اُوپر سے بازو دبا دبا کر میرا خون نکالنے لگا۔ مجھے فوجیوں کے ہسپتال میں لے گئے۔ میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ خُدا نے مجھے زندگی دی۔ میں بچ گیا لیکن ایک مہینہ مجھے چکر آتے رہے۔ زہر خون میں چلا گیا تھا۔

دو تین مہینے بعد میرے صاحب کی وہاں سے بدلی ہوگئی۔ اگر وہ برما یا ہندوستان جاتا تو مجھے ساتھ لے جاتا۔ وہ سمندر پار جا رہا تھا۔ اُس کے جانے کے بعد میں بے روزگار ہو گیا۔ اِدھر اُدھر جو مزدوری ملی کرتا رہا۔ اسی دوران ایک آدمی نے مجھے اپنا دوست بنا لیا۔ وہ ایک جھونپڑے میں اکیلا رہتا تھا۔ میرے ساتھ وہ چھوٹے بھائیوں اور بیٹوں کا سا سلوک کرتا تھا لیکن وہ شریف آدمی نہیں تھا۔ پہلے پہل وہ مجھے کہتا رہا کہ کہیں نوکری دلا دے گا، پھر اُس نے میرے ساتھ نوکری کے خلاف باتیں شروع کردیں۔ اس سے

پہلے اُس نے مجھے بتایا نہیں تھا کہ وہ کیا کام کرتا ہے بلکہ اُس نے مجھے پتہ ہی نہیں چلنے دیا تھا۔

ایک روز اُس نے مجھے بتا دیا کہ وہ کیا کرتا ہے۔ وہ رہزنی اور چھوٹی موٹی چوری چکاری کرتا تھا۔ اس کام کا اُسے شاید پورا تجربہ نہیں تھا۔ اُس نے ایسے اچھے لہجے میں مجھے ان جرائم کے فوائد بتائے کہ میں اُس کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں اَن پڑھ اور کچے دماغ کا نوجوان تھا۔

اُس نے مجھے زبانی زبانی ٹریننگ دی اور ایک روز اُس نے مجھے بتایا کہ تین آدمی شہر میں کوئی مال بیچ کر کل واپس جا رہے ہیں۔ اُس وقت دیہاتی علاقے میں سڑکیں اور موٹریں نہیں تھیں۔ لوگ خچروں، ٹٹوؤں اور گھوڑوں پر دیہاتی علاقے میں سفر کرتے تھے۔ میرے استاد نے بازار میں پیچھا کرکے معلوم کر لیا تھا کہ وہ مال بیچ چکے ہیں اور اگلے روز ٹٹوؤں پر واپس جا رہے ہیں۔ اس نے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں، کس راستے سے جا رہے ہیں اور کس وقت جا رہے ہیں۔ اُس نے انہیں راستے میں لُوٹنے کی سکیم بنائی اور مجھے بتایا کہ وہ تاجر ہیں اور تاجر عموماً ڈرپوک ہوتے ہیں۔ ہمارے پاس چاقو ہوں گے۔ ہم انہیں جان سے مار دینے کی دھمکی دے کر ان سے سب کچھ دھروا لیں گے۔

وہ بڑے لمبے لمبے دو چاقو لے آیا اور مجھے بتاتا رہا کہ رہزنی کس طرح کی جاتی ہے۔ دوسرے دن وہ پہلے بازار گیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اُس نے یہ کس طرح معلوم کیا کہ وہ تینوں آدمی فلاں وقت جا رہے ہیں۔ مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔

بہت دور پہاڑی علاقے میں ایک جگہ ایسی آگئی جس کے اِدھر اُدھر چٹانیں اور جنگل تھا۔ ایک لمبی چٹان نے راستے کو اس طرح دو حصوں میں کاٹ دیا تھا کہ دونوں طرف سے جایا جا سکتا تھا۔ یہ تو معلوم نہیں تھا کہ وہ تینوں کون سا راستہ اختیار کریں گے۔ اُس نے مجھے کہا وہ چٹان کے اس طرف رہے گا اور میں چٹان کی دوسری طرف چلا جاؤں۔ وہ جس کی طرف آئیں

وہ دوسرے کو آواز دے کر بلا لے۔ وہ جگہ چٹانوں اور درختوں نے گھیر رکھی تھی۔ میں دوسری طرف چلا گیا۔

وہاں جب میں اکیلا کھڑا ہُوا تو میں اس جُرم سے ڈرنے لگا۔ میں نے ایک چوری کی تھی جس کی سزا مِل گئی تھی۔ میں نے چوری کا خیال بھی کبھی دل میں نہیں آنے دیا تھا۔ میرے استاد نے مجھے ایسی اچھی باتیں بتائی تھیں کہ میں نے اس کے تصور سے دل کو خوش کر لیا۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ دولت آ گئی جو ہم لُوٹنے والے تھے۔ بہت سارا وقت انتظار میں گزر گیا۔

ویسے ہی میری نظر سامنے ایک درخت کے نیچے گئی۔ وہاں ایک سیاہ سانپ پھن پھیلائے جھوم رہا تھا۔ اس کے اردگرد اسی قسم کا ایک اور سانپ آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا۔ یہ جوڑا تھا۔ وہ مجھ سے بیس بائیس قدم دُور تھے۔ میرا خون خشک ہو گیا۔ مجھے بچھو کا ڈنک یاد آ گیا۔ میں نے یہ سوچا ہی نہیں کہ پتھر ماروں تو سانپ بھاگ جائیں گے۔ میرے دل میں یہی خوف بیٹھ گیا تھا کہ ایک چوری کرتے بچھو نے ڈس لیا تھا۔ اب اس سے بڑا جُرم کرنے آیا ہوں تو دو سانپ آ گئے ہیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ ان سانپوں کو خدا نے بھیجا ہے۔ میں جہاں کھڑا تھا وہیں سُن ہو کر کھڑا رہا۔

مجھے دوسری طرف سے آواز سُنائی دی ــ "اِدھر آجاؤ" ــ میں خاموش کھڑا رہا۔ منہ سے آواز نکالتے ڈر آتا تھا کہ دونوں سانپ میری طرف آجائیں گے اور مجھے مار ڈالیں گے۔ اُدھر سے ٹٹوؤں کے پاؤں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ میں جم کر کھڑا رہا۔ سانپ آپس میں کھیل رہے تھے۔ اِدھر اُدھر سے گزرنے کا راستہ کافی کُھلا تھا لیکن میں وہاں سے ہلتا نہیں تھا۔ صرف اتنی حرکت کی کہ جس درخت کے نیچے میں کھڑا تھا اس کی اوٹ میں ہو گیا اور نظریں سانپوں پر لگائے رکھیں۔ چٹان کی دوسری طرف مجھے کچھ شور سا بھی سنائی دیا۔ ٹٹو شاید رُک گئے تھے۔ ذرا دیر بعد ٹٹو بہت تیز چل پڑے اور ان کے پاؤں کی آوازیں دُور چلی گئیں۔ مجھے امید تھی کہ میرا استاد اِدھر آئے گا۔ پھر معلوم نہیں کیا ہو گا۔

جو سانپ وہیں اِدھر اُدھر آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا ایک طرف کو تیزی سے چلا گیا۔ دوسرے نے پھن پھیلا رکھا تھا۔ اس نے دوسرے کو دیکھا اور پھن سمیٹ کر اس کے پیچھے چلا گیا۔ فوراً ہی دونوں غائب ہو گئے۔ میں دوڑ پڑا اگر دوسری طرف پہنچا تو میرا دل بڑے زور زور سے اُچھلنے لگا۔ خوف نے میرا گلا گھونٹ لیا۔ میرا استاد اوندھے مُنہ پڑا تھا۔ اُس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے اُسے سیدھا کیا۔ اُس کا چہرہ خون میں ڈوبا ہُوا تھا اور وہ مر چکا تھا۔ اُس کا چاقو قریب ہی پڑا تھا۔ میں جو کچھ سمجھ سکا وہ یہ تھا کہ اُس نے ان تین آدمیوں کو اکیلے ہی روکا اور انہیں چاقو سے ڈرایا ہو گا۔ وہ تینوں ٹٹوؤں سے اُتر آئے ہوں گے اور اسے ڈنڈوں وغیرہ سے مار ڈالا ہو گا۔ زخم اور چوٹیں ڈنڈوں کی معلوم ہوتی تھیں۔ اُس کی لاش دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ جنگلوں اور بیابانوں میں رقم اپنے ساتھ لے کے چلنے والے ڈرپوک نہیں ہو سکتے اور وہ ہتھیار اپنے ساتھ رکھتے ہوں گے۔

مجھے سانپوں نے موت سے یا اس جُرم سے بچا لیا لیکن اپنے اُستاد کی لاش نے میرے ہوش گم کر دیے۔ میں نہیں سمجھ سکتا تھا کہ کیا کروں۔ یاد نہیں کہ میں وہاں کتنی دیر بیٹھا رہا۔ وہاں قریب سے راستہ مُڑتا تھا۔ میں نے سر نیچے کر رکھا تھا۔ مجھے اتنا بھی ہوش نہیں تھا کہ کوئی آ رہا ہے۔ مجھے اُس وقت ہوش آیا جب کسی نے میرا سر اٹھایا۔ دو آدمی کھڑے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ دوسرے نے بہت سے مرے ہُوئے پرندے رسّی سے بندھے ہُوئے اٹھا رکھے تھے۔ وہ شکار کھیل کر آئے تھے۔

بندوق والے نے بندوق کی نالی میرے قریب کر کے پُوچھا ــ "یہ کون ہے؟ کس نے مارا ہے اسے؟"

"میں نے اسے نہیں مارا" ــ میں نے گھبرا کر کہا ــ "معلوم نہیں یہ کون ہے .... یہ میرا دوست ہے .... خدا کی قسم اسے میں نے نہیں مارا" ــ میری گھبراہٹ اور بے تُکے جواب نے انہیں شک میں ڈال دیا۔

مجھے اپنے آگے لگا کر وہ مجھے شہر لے گئے اور پولیس سٹیشن لے جا کر تھانیدار کے سامنے جا کھڑا کیا۔ تمام راستہ بندوق کی نالی میری پیٹھ کے ساتھ لگی رہی۔ انہوں نے تھانیدار کو بتایا کہ یہ لڑکا ایک لاش کے پاس بیٹھا ہُوا تھا۔ تھانیدار کو بھی میں نے جو جواب دیا وہ شک پیدا کرتا تھا۔ پولیس مجھے اپنے ساتھ لے گئی۔ لاش وہیں پڑی تھی۔ میں نے تھانیدار کو صاف بات بتا دی، یعنی یہ کہ ہم تین آدمیوں کو لُوٹنے آئے تھے۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ مجھے سانپوں نے روکے رکھا۔

پولیس مجھ پر اعتبار کیوں کرتی؟ ثبوت کی ضرورت تھی۔ مجھے پولیس سٹیشن میں قید کر دیا گیا۔ تھانیدار اُن تین آدمیوں کا سراغ لگانے لگا جو مال بیچ کر گئے تھے۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں تھا کہ اُنہوں نے کس کے پاس مال بیچا اور مال کیا تھا۔ مجھے پولیس سٹیشن میں بہت بُری طرح مارا پیٹا گیا۔

تیسرے دن بازار سے ان آدمیوں کا سراغ مل گیا۔ پولیس کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ دو دنوں میں ان آدمیوں کو پولیس تھانے میں لے آئی۔ میرا اُستاد شاید لاوارث تھا۔ پوسٹ مارٹم کے بعد لاش پولیس کو دی گئی تو کوئی بھی لاش لینے نہ آیا۔ پولیس نے معلوم نہیں اسے دفن کر دیا یا جلا دیا۔ ان تین آدمیوں کو میرے سامنے کھڑا کر کے پوچھا گیا کہ یہی تھے وہ آدمی؟ میں نے انہیں دیکھا ہی نہیں تھا اس لیے کہہ دیا کہ میں انہیں نہیں پہچانتا۔ اُنہوں نے کہا کہ وہ مجھے نہیں پہچانتے اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ انہوں نے کسی کو نہیں مارا اور وہ اس راستے سے واپس گئے ہی نہیں۔ مجھے جو شکاری پولیس سٹیشن لے گئے تھے انہوں نے کہا کہ انہوں نے اس راستے سے گزرتے کوئی ایسے آدمی نہیں دیکھے جو ٹٹوؤں پر سوار ہوں۔

میرے جسم کو پولیس نے توڑ دیا تھا اور میرا دماغ کام نہیں کرتا تھا۔ میں صرف روتا اور قسمیں کھاتا تھا۔ جو قتل ہو گیا تھا وہ بھی لاوارث تھا اور میرا بھی کوئی نہیں تھا۔ میں ویسے ہی پولیس سٹیشن میں پڑا رہا۔ کبھی مجھے قید سے نکال کر پولیس سٹیشن کی صفائی پر لگا دیتے۔ کبھی تھانیدار اپنے گھر لے جا کر مجھ سے اپنے باغیچے میں کام

کراتا۔ میں اس کی منتیں کرتا رہتا کہ مجھے چھوڑ دے مگر وہ چھوڑتا نہیں تھا۔ اس نے میری مار پٹائی ختم کر دی۔

ایک مہینے سے زیادہ عرصہ گزر گیا تو تھانیدار نے مجھے کہا کہ وہ مجھے اس شرط پر چھوڑ دے گا کہ میں وہاں سے بھاگوں نہیں اور اُس کے بتائے ہوئے کام کروں۔ اُسے شاید یقین آ گیا تھا کہ میں قاتل نہیں ہوں اور شاید اُس نے دیکھ لیا تھا کہ میں اس کے کام کا آدمی ہوں۔ وہ مجھے وہاں مفت نہیں رکھ رہا تھا، کہتا تھا کہ روٹی، کپڑا اور اُجرت ملتی رہے گی۔

میرے دونوں کام ہو گئے۔ رہائی بھی مل گئی اور نوکری بھی۔

کام شریفوں والا نہیں تھا۔ ایک آدمی کو میرا استاد بنا دیا گیا۔ تمہیں شاید معلوم ہو گا کہ پولیس کو خفیہ آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے جو شہر اور ارد گرد کے علاقے کی خبر رکھتے ہیں اور مشکوک آدمیوں کی رپورٹیں تھانیدار کو دیتے رہتے ہیں۔ یہاں کراچی میں بھی ایسے ہی ہوتا ہے اور ہر جگہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں نے اس کام کی ٹریننگ لے لی۔

ایک روز ایک آدمی پولیس سٹیشن میں آیا۔ رہزنوں نے اُسے لُوٹ لیا تھا۔ تھانیدار نے اُس کی رپورٹ لکھی اور اُسے رخصت کر دیا۔ چار پانچ دنوں بعد تھانیدار نے مجھے ایک گاؤں کا نام بتایا، راستہ بھی بتایا اور ایک آدمی کا حلیہ بھی بتایا اور کہا کہ اُسے کہنا کہ مجھے راج نے بھیجا ہے اور کیا بات ہے کہ تم نے اتنے دن گزار دیے ہیں۔

میں اُس گاؤں میں چلا گیا اور وہ آدمی بھی مل گیا۔ میں نے اُسے تھانیدار کا پیغام دیا تو اُس نے کہا کہ تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ مجھے ابھی تین مہینے ہوئے ہیں، اگر تمہیں شک ہے تو پولیس سٹیشن چلے چلو۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ چار سو روپے دے کر کہا کہ انہیں کہنا کُل بارہ سو تھا۔ میں نے یہ رقم تھانیدار کو لا کر دے دی۔ اس میں سے اُس نے پچیس روپے مجھے دیے۔ جس آدمی نے رہزنی کی رپورٹ درج کرائی تھی وہ کئی بار میری موجودگی میں تھانیدار کے پاس آیا۔ ایک روز میں نے اُس سے پوچھا کہ اس کی کتنی رقم نکلی ہے۔

اُس نے کہا — "بارہ سَو روپے"۔ وہ آتا رہا اور مایوس ہو کر جاتا رہا پھر اُس نے آنا چھوڑ دیا۔

میں ایک سال تھانیدار کے کام کرتا رہا۔ چوری اور رہزنی کی کتنی اور وارداتیں ہُوئیں جن میں آدھے مجرم پکڑے گئے۔ باقی معلوم ہونے کے باوجود کہ کون ہیں نہیں پکڑے گئے کیونکہ میں اُن کے پاس جا کر تھانیدار کا حصّہ لے آتا تھا۔ میں نے تین چار بار اُسے کہا کہ مجھے یہ کام پسند نہیں اس لیے مجھے چھٹی دے دے۔ اس کے جواب میں ہر بار اس نے کہا — "تو چلو اندر۔ تمہارا قتل کا کیس تو میں نے بڑی مشکل سے دبا رکھا ہے۔ کہتے ہو تو کل کورٹ میں لے جا کر سزائے موت دِلا دوں گا۔"

میں نے دیکھ لیا تھا کہ یہ تھانیدار کیا کچھ کر سکتا ہے۔ ڈاکو اور رہزن اس کے ہاتھ میں تھے۔ قانون اس کے ہاتھ میں تھا۔ مجھ میں اتنی عقل تو تھی نہیں کہ میں اسے کہتا کہ ایک سال سے اُوپر عرصہ ہو گیا ہے تم نے قتل کا کیس گول کر رکھا ہے اور میں ان تمام مجرموں کو جانتا ہوں جن سے تم ہر واردات کا حصّہ لیتے ہو مگر میں اس سے اتنا ڈرا ہُوا تھا کہ اس کے آگے اُونچی سانس بھی نہیں لیتا تھا۔

میں نے تمہیں بتایا ہے کہ دوسری جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ جنگ برما کی طرف بھی آ گئی۔ اس کا ہمیں اس طرح پتہ چلا کہ برما سے لوگ جو آسام، بنگال اور ہندوستان کے رہنے والے تھے اور وہاں کاروبار اور ملازمت کرتے تھے پاپیادہ بھاگے آ رہے تھے۔ جاپان کی فوجیں برما میں آ گئی تھیں۔ اُس وقت برما انگریزوں کے پاس تھا۔ اُن کی فوج کو جاپانیوں نے بہت بُری شکست دے کر بھگا دیا تھا۔ لوگوں کے قافلے اور کُنبے سخت بُری حالت میں بھاگے آ رہے تھے۔ آسام میں ابھی گڑبڑ نہیں تھی۔ وہاں کے لوگوں پر خوف و ہراس چھا گیا تھا۔

ایک روز تھانیدار نے رات کے وقت مجھے اپنے گھر بلایا۔ اُس کے پاس ایک اور آدمی بیٹھا ہُوا تھا۔

"تم ایک آدمی کو قتل کر چکے ہو" — تھانیدار نے مجھے کہا — "ایک اور آدمی کو قتل کر دو تو تمہارے پہلے قتل کے کاغذات تمہارے سامنے جلا دوں گا۔"

"اور جو انعام مانگو گے ملے گا" — اُس کے پاس بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا۔ میں نے ایک بار پھر قسمیں کھائیں کہ میں نے اُسے قتل نہیں کیا تھا۔ تھانیدار نے پھر اپنی دھمکی دُہرائی اور اُس کے دوست نے روپے پیسے کا لالچ دیا۔ تھانیدار نے یہ بھی کہا کہ کام کر دو گے تو انعام بھی ملے گا اور قتل کے کیس سے بھی ہمیشہ کے لیے چھوٹ جاؤ گے۔ اگر بھاگو گے تو ایک دن میں پکڑے جاؤ گے۔ تم نے دیکھ لیا ہے کہ میرا جال کتنی دُور تک بچھا ہُوا ہے۔ اب تم قتل کی جو واردات کرو گے اس میں تمہیں پوچھے گا بھی کوئی نہیں۔

ان دونوں نے مجھے تیار کر لیا۔ طے یہ ہُوا کہ وہ آدمی مجھے اپنے گاؤں لے جائے گا۔ جسے قتل کرانا ہے وہ آدمی مجھے دکھائے گا۔ اُسے کسی طرح باہر لائے گا اور میں اُسے قتل کر کے بھاگ آؤں گا۔ میں اس آدمی کے ساتھ اس کے گاؤں جا رہا تھا۔ راستے میں اسے کہا کہ وہ مجھے صاف صاف بتا دے کہ یہ قصّہ کیا ہے۔ اُس نے بتایا کہ اُس نے ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ شادی کی ہے۔ یہ آدمی اُس کی بیوی کو ورغلاتا رہتا ہے اور اس کی بیوی نے اس کے ساتھ درپردہ دوستی کر لی ہے۔ یہ تھانیدار اس آدمی (خاوند) کا دوست یا غالباً رشتہ دار تھا۔ اس نے تھانیدار کو بتایا کہ وہ اس آدمی کو کسی سے قتل کرانا چاہتا ہے۔ تھانیدار نے اسے کہا کہ وہ ایسی غلطی نہ کرے کیونکہ کرائے کے قاتل پکڑوا بھی دیا کرتے ہیں۔ تھانیدار نے دوستی یا رشتہ داری کا حق ادا کرنے کے لیے اسے کہا کہ وہ اسے اس کام کے لیے اپنا آدمی دے گا جس کے پکڑے جانے کا خطرہ نہیں ہو گا۔ میرے پکڑے جانے کا واقعی کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ میں پولیس کا ہی آدمی بن چکا تھا، اور یہ خطرہ بھی نہیں تھا کہ میں دھوکہ دوں گا کیونکہ میری دُکھتی رگ تھانیدار کے ہاتھ میں تھی۔

میں اُس کے ساتھ جا رہا تھا۔ اُس کی باتیں سُنیں اور میں سوچتا رہا کہ میں قتل کر سکوں گا یا نہیں۔ یہ میرے لیے ناممکن تھا لیکن میں قتل کے لیے جا رہا تھا۔ راستے میں ہمیں برما سے آنے والے کئی لوگ ملے۔ ان میں سے بعض نے کرائے کے ٹٹوؤں اور خچروں پر سامان اور بچوں کو لاد رکھا

تھا۔ بعض سے ہم نے برما کے حالات پوچھے تو انہوں نے بتایا کہ جاپانی فوجیں اس طرف بہت تیز رفتاری سے آرہی ہیں۔ یہ لوگ دہشت پھیلاتے جا رہے تھے۔ آسام کے اُس سرحدی علاقے کے لوگ بھی بھاگے آرہے تھے جو برما سے ملتا تھا۔ ہم اُسی طرف جا رہے تھے۔ میرا گاؤں بھی اُسی طرف تھا جہاں سے میں کچھ عرصہ پہلے بھاگا تھا۔ ہمیں چلتے چلتے دن گزر گیا۔ اس آدمی کا گاؤں بہت دُور تھا۔ آگے پہاڑی علاقہ آگیا۔ ہمیں کسی عورت کی چیخیں سُنائی دیں۔

مجھے اپنے ساتھ لے جانے والے آدمی نے کہا کہ جانے دو معلوم نہیں کون ہے۔ اُسے جلدی یہ تھی کہ میں اُس کے گاؤں میں جلدی پہنچ جاؤں اور اُس کے بتائے ہوئے آدمی کو قتل کردوں۔ میں عورت کی چیخوں سے بھاگ نہ سکا معلوم نہیں کون تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھی اُس پر کوئی ظلم کر رہا تھا۔ میرے پاس تھانیدار کا دیا ہُوا لمبا خنجر تھا جو میں نے اپنے کپڑوں میں چھپا رکھا تھا۔

میں اس آدمی کو وہیں چھوڑ کر اُس ٹیکری پر چڑھ گیا جس کے پیچھے سے عورت کا واویلا سُنائی دے رہا تھا۔ ٹیکری اونچی نہیں تھی۔ سورج غروب ہونے والا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک عورت کو ایک آدمی گرانے کی کوشش کر رہا تھا اور ایک آدمی نے ایک آدمی کے سینے پر ویسا ہی خنجر رکھا ہُوا تھا جیسا میرے پاس تھا۔ دو تین سال کی عمر کا ایک بچّہ پاس کھڑا رو رہا تھا اور جس آدمی کے سینے پر خنجر رکھا ہُوا تھا اُس نے بہت ہی چھوٹے سے بچّے کو اُٹھا رکھا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ان مظلوموں کو مدد کی ضرورت تھی۔

میں نے اُوپر سے انہیں للکارا اور خنجر نکال کر دوڑتا ہوا ٹیکری سے اُترنے لگا۔ میں اس طرح چلاّنے لگا جیسے میرے ساتھ بہت سے آدمی ہیں اور میں انہیں بُلا رہا ہوں۔ جتنی دیر میں میں نیچے پہنچا وہ دونوں بدمعاش بھاگ چکے تھے۔ یہ دیکھ کر میں حیران اور پریشان ہو گیا کہ وہ عورت میری سوتیلی ماں اور وہ آدمی میرا اپنا باپ تھا۔ کچھ دیر تک تو ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ باپ نے آہستہ سے پوچھا — "بیٹا تم کہاں؟"

میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں؟ باپ نے بتایا کہ برما

میں جاپانی قتلِ عام کر رہے ہیں اور آسام کی طرف آرہے ہیں۔ انہوں نے انگریزوں کی فوج کو بھی پسپا ہوتے اور اِدھر کو بھاگ کر آتے دیکھا تھا۔ گاؤں کے گاؤں خالی ہو گئے۔ میرا باپ بھی اپنے خاندان کو ساتھ لے کر بھاگ آیا۔ انہیں گاؤں سے چلے دو دن گزر گئے تھے۔ میری سوتیلی ماں جوان اور اچھی صورت کی تھی۔ ان دو آدمیوں نے اُسے دیکھا تو اُن کی نیّت خراب ہو گئی۔ میرا باپ اُن کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ خدا نے مجھے شاید اس نیکی کے لیے زندہ رکھا تھا۔ مجھے باپ اور سوتیلی ماں سے نفرت تھی۔ ان کی وجہ سے میں بے گھر ہو کر ذلیل و خوار ہوتا پھر رہا تھا لیکن میرے دل میں رحم کی ایسی لہر آئی کہ دل سے نفرت نکل گئی۔

یہ دونوں بچّے میری سوتیلی ماں کے تھے جو میرے بعد پیدا ہوئے تھے۔ میرا باپ اور سوتیلی ماں مجھ سے بہت ہی شرمسار تھے۔ باپ نے تو کچھ نہ کہا، سوتیلی ماں نے روتے ہوئے میرے آگے التجا کی کہ میں اُسے اپنی حفاظت میں لے لوں۔ یہ تو میں پہلے ہی سوچ چکا تھا کہ انہیں اس ویرانے میں اکیلے نہیں جانے دوں گا۔

مجھے جو آدمی اپنے ساتھ لے جا رہا تھا اُسے میں نے دھوکہ دیا۔ اُسے کہا کہ وہ مجھے اپنا گاؤں بتا دے، میں انہیں ذرا آگے تک چھوڑ آؤں۔ وہ مجھے جانے نہیں دے رہا تھا اور میں اُس کے ساتھ جانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اِس وقت وہ واپس پولیس سٹیشن نہیں جائے گا۔ اُس نے پھر ضد کی تو میں نے اُسے یہ کہہ کر ڈرایا کہ تم جانتے ہو کہ میں پیشہ ور قاتل ہوں، اگر تم نے مجھے پریشان کیا تو تمہیں قتل کر کے غائب ہو جاؤں گا۔ تم اپنے گاؤں جاؤ، میں صبح سویرے آجاؤں گا۔ میں نے اُسے یہ نہیں بتایا کہ یہ میرا باپ ہے اور اس کے ساتھ میری سوتیلی ماں ہے۔

میرے دماغ میں بڑی اچھی ترکیب آگئی۔ میں نے اُسے الگ کر کے کہا — "میں تمہارے ساتھ تمہارے گاؤں چلا چلتا ہوں لیکن تمہارا کام اس شرط پر کروں گا کہ مجھے دو ٹٹو دے دو۔ میں ان دونوں کو شیلانگ تک پہنچا کر

واپس آجاؤں گا۔ اگر یہ کام کردو تو میں تم سے قتل کی اُجرت نہیں لوں گا۔"

وہ راضی ہوگیا۔ شام کے بعد ہم اُس کے گاؤں پہنچے۔ راستے میں اُس نے مجھ سے پوچھا کہ میں اس عورت کی خاطر اُن کی مدد کر رہا ہوں یا کوئی اور وجہ ہے؟ میں نے اُسے بتایا کہ میں قتل کر سکتا ہوں لیکن کسی عورت کو تکلیف اور مصیبت میں نہیں دیکھ سکتا۔ ایسی ہی کچھ اور جھوٹی سچی باتیں کر کے اُس پر اپنا اعتبار جما لیا۔ اُس نے دو ٹٹوؤں کا انتظام کر دیا جو مجھے معلوم نہیں کہ اُس کے اپنے تھے یا کسی سے رات بھر کے لیے مانگ کر لایا تھا۔ میں نے ایک پر باپ اور ایک بچّے کو اور دوسرے پر سوتیلی ماں اور چھوٹے بچّے کو سوار کرایا اور بنگال کا رُخ کر کے چل پڑا۔ میں نے انہیں کہا کہ رات کو جاگتے رہنے کی کوشش کریں، ساری رات چلنا ہے۔ اس سے پہلے بھی مجھے پتہ چلا تھا کہ برما سے بھاگ کر آنے والے بعض اکیلے لوگوں کو آسامیوں نے روک کر لُوٹ لیا تھا۔ عورتیں بھی اغوا ہوئی ہوں گی۔

باپ اور سوتیلی ماں مجھ سے پوچھتے رہے کہ میں اتنا عرصہ کہاں رہا اور کیا کرتا رہا۔ میں نے انہیں اس کے سوا کچھ نہ بتایا کہ شیلانگ میں کسی کے گھر نوکری کر لی تھی۔ سوتیلی ماں میرے ساتھ بہت پیار کی باتیں کرتی تھی جن میں خوشامد بھی تھی۔ اُسے شاید ڈر تھا کہ میں اُس سے بدسلوکی کا انتقام لوں گا۔ .... میں نے کوئی فالتو بات نہیں کی۔

ساری رات چلتے رہے۔ دو بار باپ ٹٹو سے اُترا اور مجھے سوار کر دیا۔ صبح تک ہم بہت دُور نکل گئے تھے۔ ذرا سا رُکے۔ پانی پیا۔ جنگل سے جو پھل ملا وہ کھایا۔ بڑے بچّے کو کھلایا۔ چھوٹے نے ماں کا دودھ پی لیا اور پھر ہم چل پڑے۔

دو تین روز کی مسافت کے بعد ہم بنگال میں داخل ہوئے۔ یہ میمن سنگھ کا علاقہ تھا۔ وہاں پہنچتے ہی پہلا حادثہ یہ ہُوا کہ باپ جو راستے میں ہی بخار میں مبتلا ہو کر قے کرنے لگا تھا، بنگال پہنچتے ہی مر گیا۔ ہم بہت دن خراب ہوتے رہے۔ کسی نے بتایا کہ چٹاگانگ میں نوکری مل جائے گی۔ ٹٹوؤں پر سوار ہو

اور وہاں چلے گئے۔ وہاں بندرگاہ پر مزدوری مل گئی۔ جنگ کا زمانہ تھا، روزگار کی کمی نہیں تھی۔ دونوں ٹٹو بیچ دیئے اور بنگالیوں کی طرح ایک جھونپڑا بنا لیا۔ کھانے پینے کو ملنے لگا۔ زندگی بہتر ہوگئی۔ مجھے کسی نے بتایا کہ میری سوتیلی ماں کے طور طریقے اچھے نہیں۔ میری غیر حاضری میں وہ کسی آدمی سے ملتی تھی۔

ایک روز میں نے اُس سے پوچھا تو اُس نے مجھے جھٹلا دیا۔ میں نے اُسے دھمکیاں دیں تو وہ میرے ساتھ لڑ پڑی۔ چار پانچ دنوں بعد میں بندرگاہ پر کام کر رہا تھا تو وہ آگئی۔ اُس نے چھوٹے بچے کو اُٹھا رکھا تھا اور دوسرا اُس کے ساتھ تھا۔

اُس نے بڑی بے شرمی سے کہا — "میں جا رہی ہوں۔ اپنا گھر جا کے سنبھال لو۔"

میری سُنے بغیر وہ چلی گئی۔ دُور ایک آدمی کھڑا تھا۔ وہ اُس کے ساتھ ہو لی۔ میں نے اُسے ایک بادبانی کشتی میں بیٹھتے دیکھا۔ میں اُسے روک نہیں سکا۔ روکتا کیسے! وہ میری کچھ بھی نہیں لگتی تھی۔ وہ میرے باپ کی بیوی تھی۔ باپ، مر چکا تھا۔ کشتی اُسے معلوم نہیں کہاں لے گئی۔ وہ جوان تھی۔ اُسے ایک ساتھی مل گیا تھا۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ اُس نے اُس کے ساتھ شادی کر لی تھی یا اُسے کہیں چلتا کیا تھا۔ میں خوش ہُوا کہ یہ بوجھ سر سے اُترا۔ پھر میں چٹاگانگ میں ہی رہا۔ چند سال بعد بنگال مشرقی پاکستان بن گیا تو میں ڈھاکہ چلا گیا۔ اب میرا دماغ تیز ہوگیا تھا۔ وہاں بھی نوکری مل گئی اور غریب سی ایک بنگالن کے ساتھ شادی کر لی۔ ڈھاکہ مشرقی پاکستان کا دارالحکومت بنا تو اس شہر کی قسمت جاگ اُٹھی۔ وہاں عمارتیں اور سڑکیں بننے لگیں اور کاریں چلنے لگیں۔ میرے دو دوستوں نے مجھ پر یہ احسان کیا کہ مجھے ڈرائیونگ سکھا دی۔ اس ہنر نے میرے لیے عزّت اور بہتر زندگی پیدا کر دی۔ پرائیویٹ کاروں والوں کی نوکری کی اور ۱۹۷۰ء کا سال آگیا۔

اس سال کے آخر میں ملک کے اندرونی حالات بہت خراب ہو چکے تھے۔ میرے جو ڈرائیور دوست بنگالی تھے، انہوں نے مجھے کہا

کہ یہاں سے نکل جاؤ کیونکہ مغربی پاکستان کے جو لوگ یہاں ہیں اُن کے خلاف بہت بڑی سازش ہو رہی ہے۔ ہو سکتا ہے قتلِ عام بھی ہو جائے۔ میرا دل مانتا نہیں تھا کہ بھائی بھائی کو قتل کرے گا لیکن میرا اُٹھنا بیٹھنا بنگالیوں کے ساتھ تھا، وہ مجھے خفیہ باتیں بتاتے تھے اور میں خود بھی دیکھ رہا تھا کہ بنگالی اور غیر بنگالی میں دشمنی پیدا ہو گئی ہے جو تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ مجھ پر خدا نے یہ کرم کیا کہ میرے دماغ میں یہ ڈال دی کہ یہاں سے نکل جاؤ۔ سمندر کے راستے کھلے تھے۔ میں ایک روز اپنے بیوی بچوں کو بحری جہاز پر سوار کرا کے کراچی لے آیا۔ یہاں کچھ خواری ہوئی لیکن ایک ٹیکسی مل گئی۔

"بیٹا!" اُس نے کہا — "میں نے تمہیں یہ کہانی اس لیے سنائی ہے کہ خدا ہر کسی کو کسی نہ کسی یا بہت بڑے نیک کام کے اشارے اور موقعہ دیتا ہے۔ مجھے خدا نے اشارے دیے جو میں سمجھ گیا۔ میرا باپ مر گیا۔ سوتیلی ماں بھاگ گئی لیکن میں آج بھی خوش ہوں کہ میں نے اس عورت کی عزت اور باپ کی جان بچائی تھی۔ اگر میں انعام کے لالچ میں قتل کرنے چلا جاتا تو میں خدا کی اس خوشنودی سے محروم رہتا۔ یہ اسی کا صلہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں مجھ جیسا اَن پڑھ اور جنگلی بھوکا اور بے روزگار نہیں رہا اور کراچی آ کر بھی میں خراب نہ ہُوا" — اُس نے کہا — "میں جاہل اور گنوار تھا اس لیے خدا نے شاید مجھے ہدایت دینے کے لیے بچھو اور سانپ بھیجے۔ تمہیں تو خدا نے علم کی روشنی دی ہے۔ اس سے اپنا راستہ دیکھو۔"



جہاں انسان ذبح ہوتے تھے

جرائم جو پاکستان میں ہوتے ہیں، یہ آپ کو حیران نہیں کر سکتے۔ چوری، ڈکیتی، اغوا وغیرہ کی وارداتیں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ ان کے مجرموں کو بھی آپ جانتے ہیں لیکن جو جرائم بنگال، آسام اور ان کے شمالی علاقوں میں ہوتے تھے وہ مہذّب لوگوں کی سمجھ میں ذرا دیر سے آتے ہیں۔

میں جس زمانے کی کہانی سناؤں گا، اُس زمانے میں ان علاقوں میں تہذیب نہیں گئی تھی۔ اس کی بجائے وہاں انگریزی حکومت کا قانون اور پولیس چلی گئی تھی۔ آسام کے بعض علاقوں میں ایسے قبیلے تھے جو ننگ دھڑنگ رہتے تھے اور ان کا رواج تھا کہ دشمن کو قتل کر کے اس کی کھوپڑی خشک کرتے اور اپنے پاس رکھتے تھے اور بہت سی عجیب و غریب رُسومات ان میں تھیں جو بہت خوفناک تھیں۔ کسی مہمان کو بہت ہی قیمتی تحفہ دینا چاہتے تو اُسے اپنے کسی دشمن کی کھوپڑی دیا کرتے تھے۔

ناگا اور میزو قبائل کا تعلق انہی سے ہے۔ جنگِ عظیم دوم میں جب برما جاپان کے قبضے میں آ گیا تو انگریزوں نے آسام وغیرہ کے جنگلوں اور پہاڑی علاقوں میں اپنی فوج پھیلا دی۔ جگہ جگہ دیکھ بھال اور وائرلیس سگنل وغیرہ کی پوسٹیں بنا دیں۔ مزدوری وغیرہ کے لیے ان غیر مہذّب قبیلوں سے کام لیا گیا۔ اس سے یہ لوگ تہذیب سے واقف ہوئے اور ان کا رہن سہن بدلنے لگا۔ میں نے ان لوگوں کو اس سے پہلے کی اصل حالت میں دیکھا ہے۔ ان کے طور طریقے افریقہ کے حبشیوں جیسے تھے لیکن یہ قبیلے افریقی حبشیوں سے رنگ اور شکل و صورت کے لحاظ سے

مختلف ہیں۔ ان کے رنگ صاف بلکہ بعض کے سفیدی مائل ہیں اور ان کے نقش چینیوں سے ملتے جلتے ہیں۔

میں اُس وقت بنگال پولیس میں کانسٹیبل تھا۔ چھ سال بعد مجھے اسسٹنٹ سب انسپکٹری کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ اپنی عجیب و غریب کہانی سنانے سے پہلے بنگال پولیس کے بارے میں تھوڑی سی واقفیت کرا دیتا ہوں۔ بنگالیوں، آسامیوں اور خاص طور پر جنگلی قبیلوں پر انگریزوں کو بھروسہ نہیں تھا۔ پہلے وہاں بڑی پولیس ہوتی تھی جو توڑ کر بنگال پولیس بنائی گئی لیکن اس میں بنگالی بہت کم لیے جاتے تھے۔ زیادہ نفری پنجاب کی بھرتی کی گئی اور کچھ ہندوستان کے دوسرے صوبوں سے لی گئی تھی۔ آسام اور برما پولیس میں بھی زیادہ نفری پنجابیوں اور پٹھانوں کی تھی۔

میں جس زمانے میں بنگال پولیس میں بھرتی ہوا تھا، اُس زمانے میں ہم لوگ سکول میں داخل ہونے کو اچھا نہیں سمجھا کرتے تھے۔ کوئی لڑکا دس جماعتیں پاس کر لیتا تو لوگ اُسے رُک کر دیکھا کرتے تھے۔ میرے خاندان میں تعلیم کے جراثیم داخل ہو چکے تھے۔ میں ان سے بچ نہ سکا اور میں نے آٹھ جماعتیں پاس کر لیں، پھر دل اُٹھ گیا اور میں نے آگے نہ پڑھا۔ اٹھارہ سال کی عمر ہو گئی تو بنگال پولیس کی بھرتی کا شور سُنا۔ مجھے پولیس کی نوکری اچھی لگتی تھی مگر والد صاحب اِسے بہت بُرا سمجھتے تھے۔ میں ان کی مرضی کے خلاف بھرتی ہو گیا اور ٹریننگ کے بعد مجھے بنگال بھیج دیا گیا۔ مجھے اس نوکری میں دلچسپی تھی اور میں اُس زمانے کے معیارِ تعلیم کے مطابق تعلیم یافتہ تھا اس لیے انگریز اور بنگالی افسر مجھے اچھا سمجھتے تھے۔ میرا دماغ بھی ذرا اچھا تھا۔ میں نے بہت تھوڑے عرصے میں بنگالی سیکھ لی۔

یہ واردات ۱۹۲۹/۳۰ء کی ہے۔ میری سروس پانچ چھ سال ہو چکی تھی اور میں آج کے بنگلہ دیش کے شمال مشرق کی ایک پولیس چوکی کلورا میں تھا۔ انچارج سب انسپکٹر ایک بنگالی ہندو گھوش تھا۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ رابندر گھوش تھا یا راجندر گھوش۔ وہ تعلیم یافتہ اور بہت اچھے کردار کا آدمی تھا۔ اُس نے مجھے اپنا ایک قسم کا پرائیویٹ سیکرٹری بنا رکھا تھا۔ اُس کا ایک اسسٹنٹ بھی تھا جو ہندوستان کے کسی علاقے کا رہنے والا تھا۔ محرّر ہیڈ کانسٹیبل مغیث الدین خان رام پوری

پٹھان تھا۔ سب اچھے لوگ تھے اور سب میری قدر کرتے تھے۔

ایک گاؤں سے ایک ہندو زمیندار رپورٹ لے کے آیا کہ اُس کی بیٹی عمر سولہ سال آج دوسرا روز ہے لاپتہ ہے۔ وہاں کے گاؤں ہماری طرح نہیں تھے۔ جنگلی اور پہاڑی علاقہ تھا۔ بارش زیادہ ہونے کی وجہ سے پانی جمع رہتا تھا۔ ان کے گھر اس طرح تھے کہ موٹے موٹے بانسوں پر بانسوں کے ہی بنے ہوتے چبوترے تھے اور ان پر بانسوں کے جھونپڑے کھڑے تھے۔ چھتیں سلوپ والی اور ان پر گھاس پھونس وغیرہ ڈالی گئی تھی۔ جہاں ایسے بہت سے جھونپڑے ہوتے انہیں گاؤں کہتے تھے۔ ان لوگوں کی دھان اور پٹ سن کی کھیتیاں بھی تھیں اور پاکستان کی طرح وہاں بھی زمیندار ہوتے تھے۔ یہ ہندو ایسا ہی زمیندار تھا۔ پنجاب کے زمینداروں کی طرح دولت مند تو نہیں تھا لیکن بنگال کی غربت کے مقابلے میں امیر سمجھا جاتا تھا۔

گھوش نے رپورٹ لکھنے سے پہلے وہ سوال پوچھے جو ایسے کیسوں میں ضرور پوچھے جاتے ہیں۔ لڑکی اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ چلی گئی ہوگی کسی پر شک ہے؟ کسی کے ساتھ دشمنی؟ اتنی دیر سے رپورٹ دینے آئے تو کہاں کہاں تلاش کرتے رہے؟

ہندو زمیندار نے جواب دیا کہ اُس کی بیٹی ایسی ویسی نہیں تھی۔ کسی کے ساتھ دشمنی نہیں اور کسی پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

گھوش عقل مند پولیس آفیسر تھا۔ اُس نے لڑکی کی عادتیں پوچھیں۔ شوخ تھی؟ شرارتی تھی؟ سادہ طبیعت کی تھی؟

باپ نے بتایا کہ ایسی سادہ بھی نہیں تھی لیکن شوخ اور شرارتی بھی نہیں تھی۔

"کوئی زیور یا رقم بھی چوری ہوئی ہے؟"

"نہیں"۔۔۔ لڑکی کے باپ نے جواب دیا۔۔۔ "وہ اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لے گئی۔ اُس کی ماں نے بتایا ہے کہ اُس کے کانوں میں سونے کے جھمکے اور ایک انگلی میں سونے کی انگوٹھی تھی۔"

بنگال اتنا غریب ملک تھا کہ دیہاتیوں نے سونے کا زیور شاید کبھی نہیں دیکھا

ہوگا۔ یہ شک پیدا ہوتا تھا کہ گمشدہ لڑکی کے جھُمکے اور انگوٹھی اتارنے کے لیے اسے کسی نے قتل کر دیا ہے۔ اس علاقے میں اُس زمانے میں ایسے مجرموں کی کچھ تعداد پائی جاتی تھی جن کا پیشہ چوری، ڈاکہ زنی اور بردہ فروشی تھا۔ علاقہ پہاڑی تھا۔ جنگل گھنا تھا۔ جگہ جگہ پانی جمع رہتا تھا اور چھوٹی بڑی ندیاں بھی تھیں۔ ڈاکوؤں وغیرہ کے لیے بھاگ نکلنا اور چھُپنا آسان تھا۔ ان کا شکار ہندو زمیندار اور تاجر ہُوا کرتے تھے کیونکہ روپیہ پیسہ اور سونے چاندی کے زیورات انہی کے گھروں میں ہوتے تھے۔

بنگال کا یہ علاقہ آسام سے ملتا تھا اس لیے وہاں کے باشندوں کے رنگ وہاں سے دور رہنے والے بنگالیوں کے مقابلے میں صاف تھے۔ گندمی رنگ عام تھا۔ بعض کا رنگ سفیدی مائل گندمی تھا۔ کھیتوں میں کام کرنے والے سانولے اور سیاہ رنگ کے تھے۔ فارغ البال لوگوں کے رنگ اور نقش اچھے تھے۔ ان کی آنکھوں میں بہت کشش تھی اور بال تو اور زیادہ خوبصورت ہوتے تھے۔ ان خوبیوں کا یہ نتیجہ تھا کہ روپے پیسے والے لوگ کسی نہ کسی لڑکی کو سبز باغ دکھا کر ورغلا لیتے اور غائب کر دیتے تھے یا لڑکیوں کو اٹھالے جاتے تھے۔ دونوں صورتوں میں لڑکی ڈھاکہ یا کلکتہ میں فروخت ہوتی تھی۔

گھوش کہتا تھا کہ لڑکی اگر اپنی مرضی سے نہیں گئی اور سونے کے زیور کی خاطر کسی نے اُسے قتل نہیں کیا تو اغوا ہوئی ہے۔ رپورٹ درج کرکے اور اُس کے باپ سے ضروری باتیں پوچھ کر اُسے رخصت کر دیا گیا۔ گھوش اپنے اسسٹنٹ اور ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ صلاح مشورہ کرنے لگا کہ لڑکی کی تلاش کے لیے کون سا راستہ اختیار کیا جائے۔

میں بھی وہاں موجود تھا۔ میں تفتیش میں بہت دلچسپی لیا کرتا تھا۔ گھوش بہت قابل تفتیشی افسر تھا۔ اُس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اخلاق کا بہت اچھا تھا اور اُس میں لالچ نہیں تھا۔ اُس کے دماغ میں یہ بات آئی کہ اس ہندو زمیندار کے مزارعے یا نوکر چاکر ہوں گے۔ ان کی جوان بٹیاں اور بیویاں ہوں گی۔ اس زمیندار نے ان میں سے کسی کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہوگا۔ اس بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے ان لوگوں نے اس کی نوجوان بیٹی کو اغوا کر لیا اور اُسے خراب کرکے قتل کر دیں گے۔

ہیڈ محرر مغیث نے خیال ظاہر کیا کہ اس علاقے میں دھاری دار شیر (ٹائیگر) بھی ہیں۔ ہو سکتا ہے لڑکی کو شیر اٹھا لے گیا ہو۔ گھوش نے کہا کہ یہ اس صورت میں ممکن ہے کہ لڑکی گاؤں سے باہر چلی گئی ہو اور اکیلی ہو۔ اُس کا باپ بتا گیا تھا کہ آدھی رات کے بعد لڑکی کی ماں اٹھی تو اُس نے دیکھا کہ لڑکی بستر پر نہیں ہے۔ ماں نے باہر دیکھا۔ لڑکی نہ ملی، پھر لڑکی کہیں نظر نہ آئی۔ اگر شیر لڑکی پر حملہ کرتا تو شیر کے غرّانے کے ساتھ لڑکی کی چیخیں گاؤں والوں کو ضرور سنائی دیتیں۔

گھوش زمیندار کے گاؤں گیا۔ میں اُس کے ساتھ تھا۔ پولیس کے خفیہ مخبر موجود تھے۔ وہ اپنے فرائض کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ گاؤں کے پندرہ بیس جھونپڑے تھے جو ایک دوسرے سے ذرا فاصلے پر تھے۔ ان میں ایک جھونپڑا ایسا تھا جو تھا تو بانسوں کا لیکن اینٹوں کے مکان کی طرح خوبصورت اور سب سے بڑا تھا۔ اس کی بناوٹ سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ اس ہندو کا ہے جس کی بیٹی لاپتہ ہے۔ ہمیں دیکھ کر گاؤں کے تمام آدمی، عورتیں اور بچے باہر نکل آئے اور اپنے اپنے جھونپڑے کے سامنے کھڑے ہو کر ہمیں دیکھنے لگے۔ ان کے چہروں پر خوف نظر آرہا تھا۔

ہندو زمیندار ہماری طرف آیا۔ گھوش نے اُس کی طرف توجہ نہ دی۔ اُس نے پانچ چھ آدمیوں کو اپنے پاس بلایا اور انہیں وہ رات یاد دلائی جب لڑکی لاپتہ ہوئی تھی اور پوچھا کہ انہوں نے باہر کسی قسم کی آواز یا کسی کی چیخ یا کوئی اور ایسی آواز سُنی تھی جو اُن کے لیے غیر معمولی ہو؟

سب نے سر ہلا دیئے۔ کسی نے کوئی غیر معمولی آواز نہیں سُنی تھی۔

ان لوگوں سے کچھ اور باتیں پوچھیں۔ کسی سے کوئی ایسی بات معلوم نہ ہوئی جو ہمیں لڑکی کا سراغ لگانے میں مدد دیتی۔ ہم ہندو زمیندار کے گھر چلے گئے۔ اُس کی بیوی کو علیحدگی میں بٹھا کر گھوش نے پوچھا کہ لڑکی کی عادتیں کیسی تھیں اور کیا وہ شوخ تھی؟ ماں نے جو جواب دیئے اگر وہ سچے تھے تو لڑکی کسی کے ساتھ اپنی مرضی سے نہیں گئی تھی۔ وہ خوبصورت لڑکی تھی۔

گھوش نے پوچھا کہ رات کو کسی سہیلی کے گھر جایا کرتی تھی؟ ماں نے بتایا کہ شام کے بعد لڑکیاں کسی کے گھر میں یا باہر اکٹھی ہو کر گپیں مارتی یا گاتی بجاتی ہیں

لیکن ہر لڑکی کے گھر والوں کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہاں ہے۔

"وہ گمشدگی کی شام باہر نکلی تھی؟"

"نہیں"— ماں نے جواب دیا — "یہ اُس کی عادت تھی کہ آدھی رات سے ذرا پہلے پیشاب کے لیے باہر نکلتی تھی اور جھونپڑے کے پیچھے چلی جاتی تھی۔"

ماں سے لڑکی کی سہیلیوں کے نام پوچھے۔ اُس نے تین نام بتائے۔ گھوش نے ان تینوں سے باری باری یہ سُراغ لگانے کی کوشش کی کہ لڑکی کسی کو چاہتی ہو گی اور وہ اُس کے ساتھ چلی گئی ہو گی۔ تینوں نے کہا کہ لڑکی ایسی نہیں تھی۔ یہ تو ظاہر تھا کہ لڑکی روپے پیسے کے لالچ میں آنے والی نہیں تھی۔ اُس کے گھر میں روپیہ پیسہ بہت تھا۔

"تمہاری کھیتیاں مزارعوں کے پاس ہیں"۔ گھوش نے پوچھا — "تمہارا خاوند وہاں جاتا رہتا ہے۔ مزارعوں کی جوان بیٹیاں اور بیویاں ہوں گی۔ تمہیں کبھی ایسا شک ہُوا ہے کہ تمہارا خاوند ان میں سے کسی کے ساتھ دل چسپی رکھتا ہے؟"

"میں نے کبھی ایسا شک نہیں کیا"۔ اُس نے جواب دیا — "میرا خاوند مذہب کا پابند ہے۔ پُوجا پاٹھ زیادہ کرتا ہے۔ اسی لیے کسی مُسلمان کو اپنی کھیتیوں میں کام نہیں کرنے دیتا۔"

اس کے بعد مزارعوں کی طرف توجہ دی گئی۔ اُن کے جھونپڑے وہاں سے تھوڑا دُور تھے جہاں ہندو زمیندار کی کھیتیاں تھیں۔ یہ تھوڑا سا علاقہ میدانی تھا۔ یہی اس ہندو کی زمینداری تھی۔ ان کھیتیوں کے قریب کسانوں اور مزارعوں کے جھونپڑے تھے۔ ہندو زمیندار کے مزارعوں کو باہر بلایا۔ ان کی دو جوان غیر شادی شدہ لڑکیاں تھیں اور ایک جوان شادی شدہ عورت۔ یہی ایک عورت تھی جس کی شکل وصورت اچھی اور اس کا رنگ صاف اور نکھرا ہُوا تھا۔ یہ آسام کی پیداوار تھی۔

اُس وقت بنگال اور آسام الگ الگ صُوبے تھے۔ آج کی طرح یہ الگ ملک نہیں تھے اس لیے سرحدی پابندیاں نہیں تھیں۔ جہاں دونوں صوبے ملتے تھے، اس لائن کے اِدھر اُدھر کے لوگ ایک جیسے تھے۔ آپس میں رشتے ناطے کرتے تھے، اس لیے ان کے نقش اور رنگ ملتے جلتے تھے۔

ہم وہاں پانچ چھ گھنٹے رہے۔ ہندو زمیندار کے مزارعوں کو الگ الگ کر کے پوچھا کہ زمیندار نے کسی عورت کے ساتھ دست درازی کی ہو گی۔ سب نے انکار کیا اور اپنے زمیندار کے اخلاق اور سلوک کی تعریف کی۔ گھوش نے مجھے کہا کہ یہ تو تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ زمیندار نے کوئی بدمعاشی نہیں کی ہو گی لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ مزارعوں کے ساتھ اس کا سلوک اچھا ہو گا۔ وہ اس قدر غریب لوگ تھے کہ ظلم کے خلاف بولنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ پیٹ کی خاطر ظلم اور بےعزّتی برداشت کرتے تھے۔ میں نے گھوش سے کہا کہ یہ مرے ہوئے لوگ اپنے مالک کی بیٹی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنے سے ڈرتے ہوں گے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان میں کسی نے اُس کی بیٹی کو اغوا اور قتل کیا ہو گا۔

"تم ابھی بچے ہو"— مجھے گھوش کے یہ الفاظ بڑی اچھی طرح یاد ہیں۔ اُس نے کہا — "غُربت اور مالک کا ظلم مظلوم کی زبان بند کر سکتا تھا، اس کے خلاف در پردہ کارروائی سے نہیں روک سکتا۔ مظلوم سانپ اور بچھو بن جاتا ہے، پھر وہ موقع ملتے ہی ایسا ڈنک مارتا ہے کہ ظالم کا انجام موت ہوتا ہے.... تم ابھی سمجھ نہیں سکتے کہ ظلم مظلوم کو کمزور نہیں کرتا بلکہ اُس کے اندر ایک ایسی طاقت پیدا کرتا ہے جو کسی نہ کسی وقت اُٹھ کر ظالم کو ختم کر دیتی ہے۔ یہ مزارعے جو تمہیں لاشوں کی مانند نظر آتے ہیں ان کے اندر آگ بھری ہُوئی ہے۔ اس آگ میں وہ اپنے ظالم مالک کو جلا سکتے ہیں۔"

گھوش نے ہر مزارعہ سے اور دوسرے کسانوں سے سیدھے سیدھے سوال نہیں کیے تھے۔ اُس نے پولیس کا طریقہ اختیار کیا تھا جس میں دوستی، ہمدردی اور خلوص ہوتا ہے اور ان سب کے پردے میں دھمکیاں بھی ہوتی ہیں۔ ڈرایا بھی جاتا ہے اور محبت کا اظہار بھی کیا جاتا ہے۔ اس طریقے کی کامیابی کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ سوالات کرنے والا ہوشیار اور چالاک ہو۔ گھوش میں یہ خُوبیاں موجود تھیں مگر کچھ بھی حاصل نہ ہُوا۔ میں یہ نہیں مان سکتا تھا کہ یہ مزارعے جن کی ہڈیاں نظر آ رہی تھیں اور جن کے رنگ کوئلے کی طرح سیاہ ہو گئے تھے، گھوش

سے زیادہ چالاک اور ہوشیار ہیں۔

میں جب اس جوان اور بڑی اچھی شکل اور رنگ والی آسامی عورت کو دیکھتا تھا جو ایک مزارع کی بیوی تھی تو میرا دل گواہی دیتا تھا کہ ہندو زمیندار نے اس کے ساتھ دست درازی کی ہے یا اس ہندو کے اس عورت کے ساتھ درپردہ تعلقات ہیں اور اس عورت کے خاوند یا بھائیوں نے بدلہ لینے کے لیے اس ہندو کی بیٹی کو غائب کر دیا ہے۔

گھوش سے بات ہوئی تو اُس کے دل میں پہلے ہی یہ شک موجود تھا۔ اُس نے کہا کہ اس سوال کا جواب ہمیں انفارمر (مخبر) دیں گے، لیکن اُس نے یہ کارروائی کی کہ مزارعوں کی دونوں جوان لڑکیوں اور اس عورت کو الگ کر لیا اور ایک ایک سے بھید لینے لگا۔

تینوں نے زمیندار کے اخلاق کی تعریف کی۔ سب سے زیادہ تعریف آسامی عورت نے کی۔ گھوش نے بڑی گہری اور باریک باریک باتیں پوچھنی شروع کر دیں۔ مثلاً — "تم کہتی ہو کہ زمیندار بہت اچھا آدمی ہے اور تم سب کا بہت زیادہ خیال رکھتا ہے۔ یہ بتاؤ کہ وہ تمہارے ساتھ کیا اچھائی کرتا ہے اور کس طرح خیال رکھتا ہے؟" — اور یہ سوال — "تم نے بتایا ہے کہ تم اس کے گھر بھی جایا کرتی ہو۔ کیا وہ تمہیں بلاتا ہے؟ تم جاتی ہو تو اُس کی بیوی تمہارے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہے؟"

ایسے بہت سے سوالوں کے جواب میں گھوش کو اس شک کے سوا کچھ اور حاصل نہ ہُوا کہ اس عورت اور زمیندار کے درمیان کوئی تعلق موجود ہے۔ اس عورت سے یہ معلوم کر لیا گیا کہ اس کے دو جوان بھائی ہیں جو اپنے خاندان کے ساتھ آسام کے علاقے میں رہتے ہیں۔ یہ بھی پتہ چل گیا کہ لڑکی کے لاپتہ ہونے سے دو روز پہلے دونوں آئے تھے اور جس روز ہم تفتیش کے لیے وہاں گئے اُسی صبح یعنی لڑکی کی گمشدگی کے تیسرے روز واپس چلے گئے تھے۔

آج کل تو وہ علاقے آباد ہو گئے ہیں۔ اُس زمانے میں یہ سب جنگل تھے۔ آبادی بہت کم تھی، اس لیے چھوٹے درندوں کے علاوہ وہاں شیر بھی ہوتے تھے لیکن ہمارے تھانے کے علاقے میں ایسی رپورٹ کبھی نہیں آئی تھی کہ شیر نے آبادی میں آ کر کسی انسان پر حملہ کیا ہو۔ اس واردات کی تفتیش میں ہمارا یہ شک ختم ہو گیا کہ

لڑکی کو شیر لے گیا ہے۔ بہت سے آدمیوں کو ارد گرد کے علاقے میں بھیجا گیا تھا۔ کہیں بھی خون کا نشان، لڑکی کے کپڑوں کا کوئی ٹکڑا، جسم کا کوئی حصّہ، کوئی ہڈی یا کوئی کھُرا کھوج نہیں ملا تھا۔

اس عورت کے خاوند کو بھی ساتھ لے لیا اور چوکی میں جا کر گھوش نے بذریعہ ٹیلیفون تھانے کو اطلاع دی۔ مزارع کی بیوی کے بھائیوں کا گاؤں بتایا اور کہا کہ اُن دونوں کو چوکی میں طلب کرنا ہے۔ تھانے کے انچارج نے انتظام کر دیا۔ عورت کے خاوند کو رات کو گھوش نے اپنے سامنے بٹھا لیا اور پوچھ گچھ کا ایسا پیچیدار سلسلہ شروع کر دیا کہ یہ غریب آدمی رونے پر آ گیا۔ وہ بھی جواب دیتے جا رہا تھا کہ اُسے اپنی بیوی کے چال چلن پر کوئی شک نہیں اور زمیندار اور اُس کی بیوی کے درمیان کوئی ایسا ویسا تعلق نہیں۔

اُس کی بیوی کے بھائیوں کے بارے میں پوچھا کہ کیوں آئے تھے۔ اُس نے بتایا کہ اپنی بہن سے ملنے آئے تھے۔ گھوش اُس سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ جس رات لڑکی لاپتہ ہُوئی اُس رات دونوں بھائی گھر سے غائب ہوتے ہوں گے۔ خاوند کا یہی جواب تھا کہ وہ گھر رہے۔

"تمہارے گھروں تک یہ اطلاع کب پہنچی تھی کہ تمہارے زمیندار کی بیٹی لاپتہ ہے؟" — گھوش نے اُس سے پوچھا۔

"ہمیں دوسرے ہی دن پتہ چل گیا تھا" — اُس نے جواب دیا — "زمیندار نے ہم تمام مردوں کو گھر بلا کر کہا تھا کہ اس کی بیٹی کا کہیں پتہ نہیں چل رہا، سب دُور دُور چلے جاؤ اور دیکھو کوئی درندہ تو نہیں لے گیا۔ ہم سب شام کے اندھیرے تک بہت دور دور تک گھوم آئے۔ کسی کو کوئی سراغ نہ ملا۔ میری بیوی کے دونوں بھائی بھی ہمارے ساتھ تھے۔"

اس آدمی کو گھوش نے بہت چکّر دیئے مگر اس کے منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکلی جو گھوش نکلوانے کی کوشش کر رہا تھا۔ تین چار گھنٹوں بعد وہ رو پڑا اور ہاتھ جوڑنے لگا۔ گھوش نے اُسے باہر بٹھا دیا۔ ہیڈ کانسٹیبل مغیث الدّین خان نے اندر آ کر گھوش سے پوچھا کہ اس آدمی نے کوئی مدد کی ہے یا نہیں۔ اُسے بتایا گیا کہ کچھ بھی پتہ نہیں

چلا تو مغیث نے کہا ۔ "اسے میرے حوالے کیوں نہیں کرتے؟" ۔ مغیث تشدّد کا ماہر تھا۔ چھ فٹ لمبے اور موٹے تازے مغیث کو دیکھ کر ہی چار چار پانچ پانچ فٹ کے بنگالی کانپنے لگتے تھے، اور جب وہ اپنی شہادت کی انگلی کسی مُشتبہ کی دونوں انگلیوں کے درمیان رکھ کر اُس کی انگلیاں اپنے شکنجے جیسے ہاتھ میں دباتا تھا تو مُشتبہ بنگالی بندر کی طرح کُودنے اور قلابازیاں لگانے لگتا تھا۔

اچھی باتیں جو دل میں اُتر جاتی ہیں، ساری عمر یاد رہتی ہیں۔ گھوش نے مغیث الدّین سے کہا ۔ "تم جانتے ہو یہ کتنے غریب لوگ ہیں۔ ان کے مالک اپنی بیٹیوں کے لیے سونے کے زیورات بناتے ہیں مگر یہ لوگ اپنی بیٹیوں کو صرف زندہ رکھنے کے لیے اپنا خون پسینہ ایک کرتے رہتے ہیں۔ مالک پھر بھی ان سے خوش نہیں ہوتے۔ ان مزارعوں کا عقیدہ شاید یہ ہو گیا ہے کہ ان کے خدا یہ زمیندار ہیں جو انہیں کھانے کو تھوڑے سے چاول دیتے ہیں۔ اپنی بیویوں پر بھی انہیں پورا حق حاصل نہیں۔ اپنی بیٹیوں کی عزّت کی یہ لوگ حفاظت نہیں کر سکتے.... اگر اس آدمی کی بیوی کا چال چلن اچھا نہیں تو یہ برداشت کرے گا لیکن اپنے مالک کی ناراضگی برداشت نہیں کرے گا۔ میں اس پر "تشدّد" نہیں کروں گا۔ اسے ذرا سی بھی تکلیف نہیں دوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ اس میں بدلہ لینے کی ہمت نہیں۔ اگر بدلہ لیا گیا ہے تو اس کی بیوی کے بھائیوں نے لیا ہے۔ اس آدمی سے میں اسی کی تصدیق کرانا چاہتا ہوں۔ اگر یہ بتا دے تو میں انہیں بچانے کی کوشش کروں گا۔ اگر ایک امیر آدمی کو حق حاصل ہے کہ کسی غریب کی بیوی کو بے عزّت کرتا رہے تو اس غریب کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس امیر کی بیٹی کی عزّت سے کھیلے۔ انگریزوں کا قانون کچھ اور کہتا ہے لیکن اگر مجھے یقین ہو گیا کہ اس زمیندار نے بدمعاشی کی تھی تو میں اپنا قانون چلاؤں گا۔"

اُس نے ہم دونوں کی طرف دیکھ کر کہا ۔ "تم دونوں مسلمان ہو۔ تمہارا مذہب تو اس معاملے میں زیادہ سخت ہے۔ میں کوئی گڑبڑ کروں تو تم دونوں میرا ساتھ دینا۔"

ہم دونوں نے سینوں پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کیا کہ انصاف کی خاطر اپنی سروس قربان کر دیں گے اور اُس کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔

اس آدمی کو گھر جانے کی اجازت دے دی گئی لیکن گھوش نے ایک مُخبر کو اُس پر نظر رکھنے کے لیے اُس کے پیچھے لگا دیا۔ چوکی میں تین چار مخبر آ گئے تھے۔ انہوں نے

بتایا کہ جو لڑکی لاپتہ ہو گئی ہے، وہ صاف چال چلن کی تھی۔ ایسا شک نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ چلی گئی ہے۔ اس کے باپ کے چال چلن کی رپورٹ بھی صاف تھی۔ اس مزارعہ کی بیوی بھی اچھے چال چلن کی بتائی گئی۔

ان تھوڑے سے جھونپڑوں میں یہی تھوڑے سے لوگ بستے تھے۔ وہاں کسی کی کوئی اچھی یا بُری حرکت چُھپ نہیں سکتی تھی۔

ان سب کے علاوہ جن پر شُبہ تھا وہ پیشہ ور بردہ فروش اور ڈکیت تھے۔ ان کے نام چوکی میں موجود تھے۔ یہ معلوم کرنا تھا کہ ان میں سے کوئی لڑکی کو اٹھا کر لے گیا تو کس طرح لے گیا اور کہاں لے گیا۔ لڑکی اپنے گھر والوں کے ساتھ اندر سوئی ہوئی تھی اور دروازہ اندر سے بند تھا۔ یہی ایک صورت تھی کہ مجرم کو معلوم تھا کہ لڑکی (جیسا کہ اُس کی ماں نے بتایا تھا) ہر رات اُٹھ کر جھونپڑے کے پیچھے جاتی ہے۔ مجرم وہاں کہیں چُھپا ہُوا تھا۔ وہ اسے اُٹھا کر لے گیا۔ اغوا کی وجہ لڑکی کی خوبصورتی اور نوجوانی ہو سکتی ہے۔ اگر وہ اسی طرح اغوا ہوئی ہے تو مجرم کو گاؤں کی کسی ایسی لڑکی یا عورت نے جو لڑکی کے معمول سے واقف تھی، بتایا ہو گا کہ آدھی رات کے لگ بھگ لڑکی کا اٹھ کر جھونپڑے کے پیچھے جانا معمول ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مجرم کا ایک مددگار گاؤں میں موجود ہے۔

گھوش نے بردہ فروشوں پر شُبہ کیا لیکن اُس نے یہ کہا کہ ایسا ہو نہیں سکتا کہ مجرم جھونپڑے کے پیچھے لڑکی کا انتظار کرتا رہا۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ لڑکی آدھی رات کے وقت روزمرّہ کی حاجت کے لیے اٹھ کر باہر گئی اور کسی وجہ سے دُور چلی گئی اور اتفاق سے کوئی بردہ فروش مل گیا جس نے اُسے زبردستی اغوا کر لیا۔

گھوش نے ان مخبروں سے جو چوکی میں موجود تھے، پوچھا کہ ان پیشہ ور مجرموں سے جن کے نام چوکی میں تھے، اُنہوں نے کبھی کسی کو گاؤں میں کسی کے گھر آتے یا کبھی کبھار گاؤں سے گزرتے دیکھا ہے؟

کسی نے جواب دیا کہ فلاں کو تین مہینے پہلے گاؤں کے قریب سے گزرتے دیکھا گیا تھا۔ کسی نے کسی اور کا نام لیا لیکن سب نے بتایا کہ ان میں کوئی بھی گاؤں میں کسی کے پاس کبھی نہیں آیا۔ لڑکی کے لاپتہ ہونے سے پہلے اور بعد بھی ان میں سے کسی کو گاؤں کے اندر یا باہر نہیں دیکھا گیا۔

دوسرے دن مزارعہ کی بیوی کے دونوں بھائی تھانے کے ایک کانسٹیبل کے ساتھ آ گئے۔ بڑے اچھے جوان تھے اور وہ پسماندہ دیہاتی تھے۔ بات تھوڑی کرتے اور ڈر سے کانپتے زیادہ تھے۔ گھوش کی نگاہ میں مشتبہ کی حیثیت سے ان کی قیمت اب ختم ہو گئی تھی کیونکہ مخبروں نے کہہ دیا تھا کہ ان کی بہن کا چال چلن ٹھیک ہے۔ پھر بھی گھوش ان سے بہت دیر سوال جواب کرتا رہا اور بعد میں انہیں رخصت کر دیا۔

اب تفتیش بہت ہی مشکل ہو گئی تھی کیونکہ عادی مجرموں کو ڈھونڈنا اور یہ معلوم کرنا تھا کہ کون واردات کی رات کہاں تھا اور ان میں کس پر شبہ کیا جاسکتا ہے۔ پولیس کے لیے عادی مجرموں کو ڈھونڈنا مشکل نہیں تھا لیکن ان سے سراغ لینا بہت ہی مشکل تھا کیونکہ وہ پولیس کو چکّر دینا جانتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے خلاف مخبری نہیں کرتے تھے۔ ان کا اتحاد پولیس کے لیے مشکل پیدا کر دیا کرتا تھا۔ ان میں دو تین استاد اور سزا یافتہ تھے۔ ان کے ساتھ بات چیت اور کچھ سودا بازی کر کے مجرم یا مجرموں کو پکڑا جا سکتا تھا۔ پولیس کے استاد مخبر بھی مدد کر سکتے تھے۔ گھوش نے چوکی کے مخبروں سے کہا کہ وہ اس علاقے کے عادی مجرموں کی اطلاع لائیں کہ کون کہاں ہے تاکہ انہیں پکڑا جا سکے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ سب بہت گھبراتے۔ ایک نے کہا کہ یہ کام کسی اور سے کرایا جائے کیونکہ اس میں اُن کی جان کا خطرہ ہے۔ اُن کا ڈر بجا تھا۔ تین چار سال پہلے ایک مخبر نے ایک ڈکیت کی نشاندہی کی اور وہ قتل ہو گیا تھا۔ بنگالیوں کو یہ مہارت حاصل تھی کہ ایک دو منٹ میں کسی آدمی کی آنکھیں نکال دیتے تھے۔ اس کام کے لیے وہ دھانام کا ایک ہتھیار استعمال کرتے تھے۔ چلتے چلتے اپنے دشمن کی آنکھیں نکال کر غائب ہو جاتے تھے۔ آج کل بھی بنگالی دھا استعمال کرتے ہیں اور آنکھیں نکالنے کے ماہر ہیں۔

گھوش کو ان پر غصّہ آ گیا۔ اُس نے انہیں گالیاں دیں۔ سزائے قید دلانے کی دھمکیاں دیں اور پھر انعام کا لالچ بھی دیا۔ اس سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ گھوش یا پولیس کا محکمہ اتنا بے بس تھا کہ مخبروں کے بغیر چل ہی نہیں سکتا تھا۔ پولیس مجرموں

کو زمین کے نیچے سے بھی نکال سکتی تھی۔ مخبروں کی مدد کا یہ فائدہ تھا کہ پولیس کا کام آسان ہو سکتا تھا۔ گھوش نے چوکی کے مخبروں کو غصّے سے چوکی سے نکال دیا اور کہا کہ جو کام کرے گا اُسے انعام ملے گا باقی قید ہو جائیں گے۔ یہ خالی دھمکی تھی۔ انہیں قید نہیں کیا جاسکتا تھا۔ انہیں آزادی حاصل تھی کہ مخبری سے انکار کر دیتے مگر غریب اور پسماندہ لوگ پولیس سے بہت ڈرتے تھے۔

ان کے جانے کے بعد گھوش نے اپنے اسسٹنٹ اور ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر اس علاقے کے پیشہ ور مجرموں کو چوکی میں لانے کا پروگرام بنانا شروع کر دیا۔

دن گزر گیا۔ رات کو ہندو زمیندار کے گاؤں کا ایک آدمی آیا۔ وہ کسان تھا اور در پردہ چوکی کا مخبر بھی تھا۔ یہ اُن مخبروں میں شامل تھا جنہیں گھوش نے انعام کا لالچ اور قید کی دھمکی دی تھی۔ وہ گھوش سے تنہائی میں ملا۔ مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ اُس نے گھوش سے کیا باتیں کیں۔ وہ چلا گیا تو گھوش نے مجھے بلا کر کہا کہ میں اس کے گاؤں جاؤں اور اس کی بیوی کو چوکی میں لے آؤں۔ گھوش نے مجھے یہ بھی کہا کہ میں راستے میں اُسے ڈراتا آؤں تاکہ وہ چوکی میں آئے تو اتنی زیادہ ڈری ہوئی ہو کہ راز فوراً اُگل دے۔

یہ ضروری تھا کہ گھوش مجھے بتا دے کہ اس عورت کے پاس کیا راز ہے تاکہ میں اس کے مطابق اُسے ڈراتا لاؤں۔ گھوش نے مجھے اس عورت کا نام آمی بتایا۔ چونکہ اس کیس میں اُس کا پارٹ بہت زیادہ تھا اس لیے مجھے اُس کا اور اُس کے خاوند کا نام یاد رہ گیا ہے۔ خاوند کا نام سرکار تھا۔ پورا نام یاد نہیں رہا۔ گھوش نے آمی کو چوکی میں لانے کا جو سبب بتایا وہ اس طرح تھا کہ آمی کا خاوند ابھی ابھی چوکی میں آیا تھا۔ اُس نے گھوش سے یہ کہا کہ اُس کی جان کی حفاظت کی جائے تو وہ ایک راز بتلائے گا۔

گھوش نے اُس کی جان کی حفاظت کی جھوٹی سچّی ذمّہ داری لی۔ سرکار نے بتایا کہ ایک عادی مجرم (نام مجھے یاد نہیں رہا) ان کے گاؤں آتا رہتا ہے۔ سرکار نے عجیب بات یہ بتائی کہ یہ عادی مجرم اُس کی بیوی (آمی) سے ملنے آتا ہے۔ سرکار اس مجرم سے اتنا ڈرتا تھا کہ نہ اُسے اپنی بیوی سے ملنے سے روکتا تھا نہ اپنی

بیوی کو باز رکھ سکتا تھا۔

آمی بھی آسامی تھی اور اس علاقے کی خوبصورتی کے معیار کے مطابق خوبصورت تھی۔ اُس کا رنگ آسامیوں کی طرح زردی مائل گورا تھا جس میں ہلکا سا سانولا پن بھی تھا۔ وہ جوانی کی عمر میں تھی۔ سرکار کے ساتھ اس کی شادی ہوتے دو سال گزرے تھے۔ وہ غریب والدین کی بیٹی تھی۔ سرکار گہرے سانولے رنگ کا آدمی تھا اور شریف طبیعت کا تھا۔ کسی نے آمی کی شادی سرکار کے ساتھ کرا دی۔ جو لوگ آمی کے اخلاق اور اُس کی بُری شہرت سے واقف نہیں تھے وہ حیران ہوتے تھے کہ اتنی خوبصورت لڑکی سرکار کو کس طرح مل گئی ہے۔ خود سرکار حیران تھا۔ شادی کے تین چار مہینے بعد یہ راز کھُلا کہ آمی کے تعلقات ایک عادی ڈکیت اور رہزن کے ساتھ تھے۔ وہ آمی کو اچھے اچھے کپڑے اور پیسے دیتا رہتا تھا۔

اس وجہ سے آمی کے ساتھ کوئی شادی نہیں کرتا تھا۔ ایک آدمی نے آمی کو سرکار کے ساتھ بیاہ دیا۔ آمی کے والدین اور قبیلے کا بوجھ اُتر گیا۔ آمی نے سرکار کو آتے ہی دبا لیا اور اسے کہا کہ اس سے سرکار کو پوری محبّت، توجہ اور خدمت ملے گی مگر سرکار اسے کسی اچھے یا بُرے کام سے نہ روکے۔ اگر اُس نے روکا تو اُس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی یا اُس کی آنکھیں نکال دی جائیں گی، پھر وہ اپاہجوں اور بھک منگوں جیسی زندگی گزارے گا۔ سرکار نے اس کا رُعب تسلیم کر لیا۔ اب وہ ڈکیت یہاں بھی آمی سے ملنے کے لیے آنے لگا۔ وہ مہینے میں ایک اور کبھی دو بار آتا تھا۔ اُس نے سرکار کو گہرا دوست بنا لیا تھا۔ آمی رات کو ڈکیت کے ساتھ باہر چلی جاتی اور بہت دیر بعد واپس آتی تھی۔

ڈکیت نے بھی سرکار سے کہا تھا کہ وہ اُس کا دوست بنا رہے اور وہ (ڈکیت) دوستی کا پورا حق ادا کرے گا۔ اگر اُس نے اُسے اور آمی کو ملنے سے روکا تو اس کی اُسے بڑی خوفناک سزا دی جائے گی۔ سرکار نے گھوش کو بتایا کہ آمی اُس کی بہت خدمت کرتی ہے۔ کبھی کبھی تو اُس کے ساتھ اس طرح پیار کرتی ہے جس طرح ماں بچے کے ساتھ کیا کرتی ہے لیکن اس خدمت اور پیار کی جو قیمت سرکار کو دینی پڑتی تھی وہ اُس کی برداشت سے باہر تھی مگر وہ اپنے انجام کے خوف

سے اونچی آواز نہیں نکالتا تھا۔ ڈکیت کو معلوم نہیں تھا کہ سرکار پولیس کے لیے مُخبری بھی کرتا ہے۔ آمی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ اُس نے کئی بار ارادہ کیا کہ پولیس کو ڈکیت اور آمی کے بارے میں بتا دے مگر ڈر کے مارے خاموش رہا۔

اب یہ واردات ہو گئی۔ گھوش نے مُخبروں کو دھمکی دی کہ انہوں نے اس علاقے کے عادی مجرموں کی تلاش میں مدد نہ دی تو انہیں سزائے قید دی جائے گی اور جو مدد کرے گا اُسے انعام ملے گا۔

سرکار کو قید کا اتنا ڈر یا انعام کا اتنا لالچ نہیں تھا جتنا اُس میں انتقام کا ارادہ پیدا ہو گیا تھا۔ یہ موقعہ اچھا تھا۔ اُس نے خطرہ مول لیا اور گھوش کو بتا دیا کہ ڈکیت اُس کی بیوی کے پاس آتا ہے لیکن اُس کے آنے سے یہ کیسے یقین کر لیا جاتا کہ لڑکی کو اُسی نے اغوا کیا ہے۔ سرکار نے یہ بتا کر شک پیدا کر دیا کہ جس رات لڑکی غائب ہوئی اُس رات ڈکیت آیا تھا اور اُس (سرکار) کی بیوی گھر سے چلی گئی تھی اور بہت دیر بعد واپس آئی تھی۔ سرکار نے یہ بھی بتایا کہ وہ واپس آئی تو وہ جاگ رہا تھا لیکن ظاہر یہ کیا کہ وہ سویا ہُوا ہے۔ اُس کی بیوی نے اندھیرے میں بکس کھولا اور اس میں کچھ رکھ کر بکس بند کیا اور سو گئی۔

سرکار نے یہ بھی بتایا کہ اُس کی بیوی زندہ دل ہے اس لیے نوجوان لڑکیاں اسے بہت پسند کرتی ہیں۔ ہندو زمیندار کی بیٹی جو لاپتہ تھی اسے پسند کرتی تھی۔ آمی اُس کے گھر جاتی اور وہ اس کے پاس آتی رہتی تھی۔ سرکار نے یہ بھی بتایا کہ دو اور مُخبروں کو بھی معلوم ہے کہ یہ ڈکیت اس کے گھر آتا ہے لیکن اُس کے ڈر سے کوئی بتاتا نہیں۔

گھوش نے مجھے کہا ـــ "سرکار گھر چلا گیا ہے۔ اُسے کہنا کہ تمہاری بیوی کو چوکی بلایا گیا ہے۔ سرکار اس طرح باتیں کرے گا جیسے اُسے کچھ بھی معلوم نہیں۔ وہ ساتھ چلنے کو کہے گا۔ تم اُسے کہنا کہ تم ساتھ نہیں چل سکتے۔ اُس کی بیوی کو ساتھ لے آنا۔ راستے میں اُسے ڈراتے آنا۔ کہنا کہ تم اب بچ نہیں سکو گی کیونکہ تمہارا دوست (ڈکیت) پکڑا گیا ہے" ـــ اس قسم کی کئی اور باتیں مجھے سمجھا کر گھوش نے کہا ـــ "فیروز! یہ خیال رکھنا کہ یہ عورت خوبصورت ہے اور اتنی چالاک ہے کہ تم

اسے چوکی میں لانے کے لیے جا رہے ہو لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ تم اس کے ساتھ اُس طرف چل پڑو جہاں وہ تمہیں لے جانا چاہے گی۔ مجھے ڈر ہے کہ سرکار کی طرح تم بھی اس کی خوبصورتی کے رعب میں آجاؤ گے۔ چوکی اور گاؤں میں بہت فاصلہ ہے۔"

میں نے گھوش کو کوئی جواب نہ دیا۔

ڈیڑھ گھنٹہ پیدل سفر کر کے سرکار کے گاؤں پہنچا۔ آمی گھر تھی۔ اُس کے نقش اور اُس کا رنگ ایسا تھا کہ شادی شدہ نہیں لگتی تھی۔ معلوم نہیں کیا وجہ تھی کہ اُس کا ایک بھی بچہ پیدا نہیں ہُوا تھا۔ اصلی عمر سے بہت چھوٹی لگتی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ تمہیں چوکی لے جانے آیا ہوں۔ وہ ڈر گئی۔ میں نے کسی سے کہہ کر سرکار کو کھیتوں سے بلایا۔ اُسے کہا کہ اُس کی بیوی کو چوکی لے جانا ہے۔ وہ طے کیے ہوئے ڈرامے کے مطابق ڈرنے اور گھبرانے لگا اور اُس نے ایسی باتیں کیں جن سے اس کی بیوی کو ذرا سا بھی شک نہ ہُوا کہ مخبری سرکار نے ہی کی ہے۔ سرکار نے کہا کہ وہ بھی اپنی بیوی کے ساتھ چوکی جائے گا۔ میں نے اُسے روک دیا۔

میں آمی کو ساتھ لے کر چل پڑا اور تھوڑی ہی دُور جا کر جنگل، جھاڑ اور ٹیکریوں نے ہمیں دنیا کی نظروں سے اوجھل کر دیا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ اُسے چوکی کیوں بلایا گیا ہے؟ میں نے اُسے بتایا کہ اُس کا راز کھُل گیا ہے اور اُسے معلوم ہے کہ لڑکی کس طرح اغوا ہوئی ہے۔ میں نے اُسے ڈکیت کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔ وہ رک گئی اور اُس نے میرا بازو پکڑ لیا۔ میں نے اُس کے منہ کی طرف دیکھا تو مجھے گھوش کی بات یاد آ گئی۔ اُس نے کہا تھا کہ سرکار کی طرح تم بھی اس کے رعب میں آجاؤ گے۔ آمی نے کہا کہ اُسے لڑکی کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں اور کہنے لگی کہ مجھے چوکی نہ لے جاؤ۔ میں نے اُسے بتایا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔

"میں یہاں سے کہیں اور بھاگ جاتی ہوں"۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "تم چوکی میں کہہ دینا کہ میں تمہیں گاؤں میں نہیں ملی تھی۔"

میں نے اُسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹا اور کہا کہ میں اُسے چوکی لے جاؤں گا اور میں اُس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اس نے مجھ پر اپنا جادو چلانا شروع کر دیا جس

سے گھوش نے مجھے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔ میں نے دل کو پتھر بنا لیا اور اُسے چوکی میں لے گیا اور گھوش کے حوالے کر دیا۔ گھوش نے اُسی وقت اُسے اپنے کمرے میں بٹھایا اور تفتیش شروع کر دی۔ میں دروازے کے باہر کھڑا رہا۔ آدھے پونے گھنٹے بعد مجھے اندر سے تھپڑ کی آواز سنائی دی۔ میں نے دروازے میں جا کر دیکھا۔ آمی نے ایک ہاتھ اپنے گال پر رکھا ہُوا تھا۔

مجھے دیکھ کر گھوش نے کہا۔۔۔ "یہ مجھے بھی اپنے جیسا بدمعاش سمجھتی ہے کہتی ہے وہ میرے پاس نہیں آتا۔ میں جو پوچھتا ہوں اس کا جواب دینے کی بجائے پوچھتی ہے کہ تمہیں کس نے بتایا ہے۔"

گھوش نے مجھے کمرے میں موجود رہنے کو کہا۔ آمی جتنی خوبصورت تھی اُس سے دس درجے زیادہ بدچلن تھی۔ جس بات پر گھوش نے اُسے تھپڑ مارا تھا اسی بات پر اڑی ہوئی تھی۔ اُس نے یہاں تک کہہ ڈالا کہ مجھے اپنے گھر میں رکھ لو۔ بہت وقت کے بعد اُس نے تسلیم کیا کہ ڈکیت کے ساتھ اُس کی دوستی ہے اور یہ دوستی شادی سے پہلے کی ہے مگر وہ اس سوال پر پھر اٹک گئی کہ واردات کی رات ڈکیت اس کے پاس آیا تھا۔ وہ انکار کر رہی تھی۔

میں سوچ رہا تھا کہ اگر یہ عورت تسلیم کر لے کہ ڈکیت اغوا کی رات اس کے پاس آیا تھا تو اس کا کیا ثبوت ہے کہ ہندو زمیندار کی بیٹی کو وہ اغوا کر کے لے گیا ہے۔ میں نے بعد میں گھوش سے پوچھا تھا تو اُس نے بتایا تھا کہ کوئی ثبوت نہیں تھا۔ ذرا سا شک تھا اور تفتیش شک پر ہی کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ آمی جس طرح اپنے آپ کو پیش کر رہی تھی اور وہ جس طرح سوالوں کو ٹال رہی تھی اور جس لہجے میں جواب دے رہی تھی اس سے شک پکّا ہوتا تھا کہ لڑکی کے اغوا کے ساتھ اس کا تعلق کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔

گھوش نے اس سے پوچھا کہ وہ جب ڈکیت کے چلے جانے کے بعد اپنے گھر میں واپس آئی تو اُس نے بکس میں کیا رکھا تھا؟ اُس نے جواب دیا کہ اُس نے کچھ بھی نہیں رکھا تھا۔

"پھر واپس آ کر بکس کیوں کھولا تھا؟"

"میرا خاوند تمہیں میرے بارے میں غلط باتیں بتا گیا ہے"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔

"میں نے تمہارے خاوند کی شکل بھی نہیں دیکھی"۔۔۔ گھوش نے کہا۔

"پھر تمہیں کس نے بتایا ہے؟"

"وہ تمہیں پیسے دے گیا تھا؟"۔۔۔ گھوش نے پوچھا۔

"وہ مجھے کچھ بھی نہیں دے گیا تھا۔"

گھوش نے پوچھ گچھ کا اصلی طریقہ اختیار کیا۔ آپ یقین کریں کہ اُس نے آمی کو گالی نہیں دی، سوائے ایک تھپڑ کے اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا اور اس کے منہ سے یہ نکلوا لیا کہ ڈکیت اسے کچھ دے گیا تھا، مگر آمی یہ نہیں بتا رہی تھی کہ کیا دے گیا ہے۔

آمی جنگل کی رہنے والی عورت تھی۔ گھوش جتنی چالاک نہیں ہو سکتی تھی، پھر بھی اُس نے نہ بتایا کہ ڈکیت اُسے کیا دے گیا تھا۔ گھوش کو یہیں سے شک ہُوا کہ وہ کوئی ایسی چیز دے گیا ہے جس کا تعلق اگر لڑکی کے اغوا کے ساتھ نہیں تو کسی اور واردات کے ساتھ ہوگا۔ اگر وہ پیسے یا کپڑے دے جاتا تو آمی ضرور بتا دیتی۔

گھوش نے کہا کہ چلو اس کے گھر کی تلاشی لی جائے۔ وہ اُٹھا اور آمی اٹھ کر اُس کے ساتھ لپٹ گئی۔ اُسے ابھی تک یقین تھا کہ وہ گھوش کو رام کر لے گی۔ میں نے آگے بڑھ کر اُسے گھسیٹا اور گھوش سے الگ کیا۔ رات ہو گئی تھی۔ گھوش نے کہا کہ تلاشی میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ ہم ہوا میں تیر چلا رہے ہیں۔ شاید کوئی سراغ مل جائے۔

ہیڈ کانسٹیبل مغیث الدین اور ایک اور کانسٹیبل کو بھی ساتھ لے لیا گیا۔ راستے میں آمی نے کئی بار گھوش کے قریب ہونے کی کوشش کی لیکن ہم میں سے کسی نہ کسی نے اُسے گھسیٹ لیا۔

اندھیرے میں اتنا لمبا سفر کر کے ہم اُس کے گھر پہنچے۔ سرکار سویا ہُوا تھا۔ ہماری آواز پر اُس نے بتی جلائی۔ آمی نے دانت پیس کر اُسے گالی دی اور کہا۔۔۔ "میں

تیری بوٹی بوٹی کرا دوں گی۔ یہ سب تیری کرتوت ہے"۔۔۔ سرکار ڈر گیا۔

گھوش نے آمی سے پوچھا کہ بکس کہاں ہے؟ اُس نے غصّے سے جھونپڑے کے کونے میں رکھا ہُوا ایک لکڑی کا بکس دکھا کر کہا۔۔۔ "وہ ہے دیکھ لو کیا دیکھتے

بکس کھولا۔ اس میں بڑے اچھے کپڑے پڑے تھے جو اس قسم کے غریبوں کے پاس نہیں ہُوا کرتے تھے۔ یہ ہٹائے تو چاندی کے دو تین معمولی سے زیورات نکلے اور ان میں سونے کے جھمکوں کی ایک جوڑی اور سونے کی ایک انگوٹھی بھی تھی۔ گمشدہ لڑکی کے باپ نے بتایا تھا کہ لڑکی کے کانوں میں سونے کے جھمکے اور انگلی میں سونے کی انگوٹھی تھی۔

گھوش نے آمی سے پوچھا کہ یہ دونوں چیزیں تمہاری ہیں؟

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

سرکار نے کہا۔۔۔ "یہ دونوں چیزیں ہماری نہیں ہیں۔"

گھوش نے مجھے کہا کہ ہندو زمیندار اور اُس کی بیوی کو بلا لاؤں۔ میں ان کو لے آیا تو گھوش نے جھمکے اور انگوٹھی انہیں دکھا کر پوچھا کہ وہ ان چیزوں کو پہچانتے ہیں؟

ماں نے جھپٹ کر دونوں چیزیں گھوش کے ہاتھ سے لے لیں اور بڑی تیزی سے بولی۔۔۔ "یہ میری بیٹی کا زیور ہے .... کہاں ہے وہ؟ میری بچّی کہاں ہے؟" ۔۔۔ اور وہ رونے لگی۔

"بتاؤ"۔۔۔ گھوش نے آمی سے کہا۔۔۔ "اس سوال کا جواب تم دے سکتی ہو۔"

وہ ڈھیٹ ہو گئی۔ کچھ بھی نہ بولی۔ مغیث نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر جھنجھوڑا اور کہا۔۔۔ "بولو، ان کی بیٹی کہاں ہے؟"

اُس نے مغیث کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے جھٹک دیا اور جواب دینے کی بجائے سرکار کو گھورنے لگی۔ اُس کے دانت پس رہے تھے جیسے سرکار کو کچّا کھا جائے گی۔

"چوکی لے چلو"۔۔۔ گھوش نے کہا۔

"نہیں جاؤں گی"۔۔۔ آمی نے کہا۔

"گھسیٹ کرلے چلو"۔۔۔ گھوش نے کہا۔

ہم نے اُسے گھر سے گھسیٹ کر نکالا۔ باہر آکر وہ گھسیٹے بغیر چلنے لگی۔ راستے میں گھوش اُسے بڑے اچھے طریقے سے سمجھاتا رہا کہ اب اُس نے کچھ چھپایا تو اُس کا انجام بہت ہی بُرا ہوگا۔ ہمدردی کے رنگ میں اُس کے دل میں گھوش نے جو ڈر پیدا کیا اس نے بہت کام کیا۔ جب چوکی میں پہنچے تو گھوش نے اتنی رات گزر جانے کے باوجود نہ خود آرام کیا نہ ہم میں سے کسی کو آرام کرنے دیا۔ اُس نے مجھے اور مغیث کو اپنے ساتھ بٹھالیا۔ دوسرے کانسٹیبل کو اُس نے آمی کے لیے کھانا لانے کو کہا۔

وہ چلا گیا تو گھوش نے آمی کو (جو خوف سے مری جا رہی تھی) کہا۔۔۔ "تم اپنے آپ کو قیدی نہ سمجھو۔ ہم سے بالکل نہ ڈرو۔ تم ہماری حفاظت میں ہو۔ وہ (ڈکیت) تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

اُس کا دل موم کرنے کے لیے گھوش اُس کے ساتھ بڑے پیارے لہجے میں باتیں کرتا رہا۔ ہیڈ کانسٹیبل مغیث الدین نے اور میں نے بھی ہمدردی کی باتیں کیں۔ اس سلوک نے اتنا کام کیا جو تشدد سے نہیں لیا جاسکتا۔ کھانا آگیا جو اُس نے پیٹ بھر کر کھایا۔

پہلے سوال پر ہی اُس نے ڈکیت کا نام لیا (جو میرے ذہن سے اتر گیا ہے) اور کہا۔۔۔ "لڑکی کو وہ لے گیا ہے۔"

"بیچنے کے لیے؟"۔۔۔ گھوش نے پوچھا۔

"نہیں"۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ "کالی دیوی کو قربانی دینے کے لیے۔"

"کہاں؟"۔۔۔ گھوش نے حیران ہوئے بغیر پوچھا۔

"اُس نے یہ نہیں بتایا"۔۔۔ آمی نے جواب دیا۔۔۔ "کہتا تھا دُور جنگلوں میں لے جاؤں گا۔"

یہ سن کر کہ لڑکی کو کالی دیوی کی قربانی کے لیے لے جایا گیا ہے ہم میں

سے کوئی بھی حیران نہ ہُوا۔ پرانے زمانے کے مشہور رہزن اور ڈاکہ زن جنہیں ٹھگ کہا جاتا تھا کسی خیالی دیوی کی پرستش کیا کرتے تھے۔ اسے عرفِ عام میں کالی ماتا یا کالی دیوی کہا جاتا تھا۔ ان ٹھگوں کے گروہ ہُوا کرتے تھے جو قافلوں کو لُوٹ لیا کرتے تھے۔ ریلوے ٹرین نئی نئی چلی تو وسطی ہندوستان کے نامی گرامی ٹھگ ریل گاڑیوں تک کو لوٹنے کی کوشش کرتے تھے۔ انگریزوں نے ان کی سرکوبی کے لیے فوج تک کو استعمال کیا تھا۔ آپ نے امیر علی ٹھگ اور سلطانہ ڈاکو کے قصے پڑھے ہوں گے۔ یہ انہی ٹھگوں میں سے تھے جنہوں نے فوج تک کو زچ کر دیا تھا۔ یہ ٹھگ رہزنی یا ڈاکے کی مہم پر روانگی سے پہلے کالی دیوی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے عجیب وغریب رسمیں ادا کرتے اور قربانیاں دیتے تھے۔

آسام کے پہاڑی علاقوں میں جہاں لوگ انسانی کھوپڑیاں گھروں میں رکھتے تھے، وہاں انسانوں کی قربانی کا بھی رواج تھا۔ مجھے اتنا پتہ چلا تھا کہ یہاں کے بھی ٹھگ اور ڈاکو کالی دیوی کی پرستش کرتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ واردات سے پہلے کالی دیوی کو خوش کرنا ضروری ہوتا ہے۔

گھوش نے آمی سے پوچھا کہ یہ ڈکیت کوئی بڑی واردات کرنے گیا ہے؟

آمی نے بتایا کہ اُس نے دس بارہ آدمی اکٹھے کرکے اپنا گروہ بنالیا ہے۔ ابھی انہوں نے کوئی بڑی واردات نہیں کی۔ اُس نے آمی کو بتایا تھا کہ اُس نے کالی دیوی کے ایک مہنت سے پوچھا تھا کہ اپنے گروہ کی پہلی واردات سے پہلے اُسے کیا کرنا چاہیئے جس سے کالی دیوی کی رضا حاصل ہو جاتے۔ مہنت یا پروہت نے اپنا جنتر منتر کرکے اُسے بتایا کہ ایک کنواری لڑکی کی قربانی دینی ہوگی۔ اُس نے ڈکیت کو ایسی لڑکی کی خاص نشانیاں بتائیں، عمر بھی بتائی اور آنکھوں کا کوئی خاص رنگ بتایا۔ مجھے اب یاد نہیں رہا کہ یہ رنگ اور دوسری نشانیاں کیا تھیں۔

ڈکیت ایسی لڑکی کی تلاش میں رہا۔ ایک روز وہ آمی سے ملنے آیا ہُوا تھا۔ اُس نے اس ہندو زمیندار کی بیٹی کو دیکھا۔ اس میں اُسے ساری نشانیاں نظر آگئیں۔ اس سے پہلے اُس نے آمی کو نہیں بتایا تھا کہ اُسے ایک خاص قسم کی لڑکی کی ضرورت ہے۔ ہندو زمیندار کی بیٹی کو دیکھ کر اُس نے آمی سے کہا

کہ وہ اس لڑکی کو اغوا کرنا چاہتا ہے۔

آمی بگڑ گئی کہ وہ اس لڑکی کو اپنے لیے اغوا کرنا چاہتا ہے اور آمی سے اُس کا دل بھر گیا ہے۔ ڈکیت نے اسے بتا دیا کہ وہ اس لڑکی کو کیوں اغوا کرنا چاہتا ہے۔ ڈکیت نے آمی سے یہ وعدہ بھی کیا کہ اپناگروہ پہلی واردات کرلے تو وہ آمی کو ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ لے جائے گا۔

آمی نے اُسے بتایا کہ یہ لڑکی اُس کی سہیلی ہے اور اُس کے اغوا میں وہ مدد کر سکتی ہے۔ اُنہوں نے اغوا کے طریقے سوچے لیکن مشکل نظر آتے تھے۔ آمی نے یہ طریقہ بتایا کہ وہ لڑکی کو کسی رات گاؤں سے باہر لے آئے گی اور ڈکیت وہاں موجود رہے۔ ڈکیت چلا گیا۔ دوسرے دن آمی نے لڑکی سے کہا کہ کسی رات گاؤں سے ذرا دور چل کر کھیلیں کودیں گے۔ لڑکی نے اُسے بتایا کہ ماں باپ اُسے رات زیادہ دیر باہر نہیں رہنے دیتے اور وہ گاؤں سے باہر تو جانے ہی نہیں دیں گے۔ انہی باتوں میں لڑکی نے ہنس کر کہا کہ میں آدھی رات کے اِدھر یا اُدھر پیشاب کے لیے جھونپڑے کے پچھواڑے جاتی ہوں اور فوراً واپس آجاتی ہوں۔

آمی کا دماغ بھی مجرموں والا تھا۔ اُس نے یہ بات ذہن میں رکھ لی کہ لڑکی ہر رات ذرا سے وقت کے لیے باہر نکلتی ہے۔ دو تین روز بعد ڈکیت آیا۔ آمی نے اُسے لڑکی کی یہ روزمرّہ کی عادت بتائی۔ ڈکیت نے کہا کہ آج ہی کی رات کوشش کرتے ہیں۔ سرکار کو ان کے پروگرام کے بارے میں بالکل معلوم نہیں تھا۔ ڈکیت آمی سے یہ کہہ کر غائب ہو گیا کہ فلاں وقت وہ فلاں جگہ آجائے گا۔

رات کے طے شدہ وقت پر آمی گھر سے نکل گئی۔ سرکار میں جرأت نہیں تھی کہ اُسے رات کو باہر جانے سے روک سکتا۔ وہ ڈکیت سے جا ملی۔ دونوں ہندو زمیندار کے گھر کے پچھواڑے ایک جھاڑی کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے۔

آمی نے اپنے اقبالی بیان میں کہا کہ ان دونوں میں یہ اختلاف پیدا ہو گیا کہ آمی ڈر گئی۔ اُس نے ڈکیت سے کہا کہ میں نے تمہیں صحیح جگہ صحیح وقت پر پہنچا دیا ہے۔ میں جاتی ہوں کیونکہ میں اغوا میں تمہاری کوئی اور مدد نہیں کر سکتی۔ مجھے ڈر ہے کہ میں کوئی غلطی کر بیٹھوں اور ہم دونوں پکڑے جائیں۔ ڈکیت نے اسے کہا کہ مجھے

یقین نہیں آتا کہ لڑکی اسی وقت ہر رات باہر نکلتی ہو گی۔ میں کوئی اور طریقہ سوچ رہا ہوں۔ اس میں تمہاری مدد کی ضرورت ہو گی۔

وہ سرگوشیوں میں بحث کرتے رہے اور ان میں جھگڑا ابھی شروع ہو گیا۔ اتنے میں انہیں جھونپڑے کے ایک پہلو میں ایک سایہ حرکت کرتا دکھائی دیا۔ آمی نے ڈکیت سے کہا کہ یہ وہی ہو گی۔ سایہ رُکا اور غائب ہو گیا۔ ڈکیت نے کہا کہ وہ بیٹھ گئی ہے۔ ڈکیت بیٹھے بیٹھے سرکنے لگا۔ آمی ذرا آگے ہو گئی۔ اُس نے دیکھا کہ لڑکی اٹھی اور ڈکیت نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ لڑکی کی آواز نہ نکلی۔ وہ سولہ سال کی لاغر سی لڑکی تھی اور ڈکیت جنگلوں اور پہاڑیوں میں بھیڑیوں کی طرح گھومنے پھرنے اور شکار پر جھپٹنے والا تیس پینتیس سال کی عمر کا مرد تھا۔ وہ لڑکی کو اٹھا لایا اور آمی سے کہا کہ میرے ساتھ آؤ۔

گاؤں سے دُور جا کر اُس نے لڑکی کو اتارا۔ وہ رونے لگی تو ڈکیت نے اُس کے منہ پر کپڑا باندھ دیا۔ پھر اُس نے لڑکی کے کانوں سے جھمکے اور انگلی سے انگوٹھی اتاری اور آمی کو دے کر کہا ــــ "یہ تمہارا انعام ہے۔ اب زبان بند رکھنا۔ تم اب چلی جاؤ۔"

آمی کو معلوم تھا کہ یہ زیور سونے کا ہے۔ اُس نے لڑکی کو یہ زیور پہنے دیکھا تھا۔ آمی بہت خوش ہوئی لیکن اس نے یہ نہیں سوچا کہ اسے وہ پہن کر گاؤں میں نہیں پھر سکے گی۔ وہ جنگلی عورت تھی۔ صرف جُرم کی کامیابی اور سونے کی دو چیزیں حاصل کر کے ہی خوش ہو گئی۔

ڈکیت لڑکی کو کندھے پر ڈال کر لے گیا اور آمی اپنے گھر آگئی۔ اس کا خاوند (سرکار) سویا ہوا تھا۔ (وہ دراصل سویا ہوا نہیں تھا) آمی نے جھمکے اور انگوٹھی بکس میں رکھ دیے۔

اب ہمارے لیے مسئلہ یہ تھا کہ ڈکیت کو کہاں ڈھونڈا جائے۔ آمی کہتی تھی کہ اُس نے اسے اشارہ تک نہیں دیا کہ وہ لڑکی کی قربانی کہاں دے گا۔ گھوش نے کہا کہ لڑکی تو ماری جا چکی ہے۔ اب مجرم ہی ہمارے ہاتھ آ سکتا ہے۔ اُسے ڈھونڈنے کے لیے دُور دُور کے تھانوں اور پولیس چوکیوں کو اطلاع دینی تھی۔

گھوش کو اچانک ایک خیال آگیا۔ اُس نے آمی سے پوچھا ــــ "وہ اب تمہارے پاس نہیں آئے گا؟ ایسا تو نہیں کہ تم اُس کے پاس چلی جاؤ گی؟"

"میں کیسے جاسکتی ہوں؟" ــ آمی نے جواب دیا ــــ "اُس نے مجھے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ وہ کہاں جارہا ہے .... وہ کہہ گیا تھا کہ چھ سات روز بعد آؤں گا۔ میں نے اب یہ ارادہ کر لیا تھا کہ وہ آئے گا تو اُسے کہوں گی کہ مجھے اپنے ساتھ لے چلے۔ میں اب سرکار کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔"

"مجھے شک ہے کہ اس لڑکی کی وہ قربانی نہیں دے گا" ــ گھوش نے اُسے کہا ــــ "اُسے یہ لڑکی اچھی لگی تھی، اس لیے تمہاری مدد سے اُسے لے گیا ہے۔ اب وہ تمہاری جگہ اُسے اپنے ساتھ رکھے گا۔ اگر تمہیں پتہ ہے کہ وہ کہاں گیا ہے تو ہم اُسے پکڑلیں گے۔ اُس نے تمہارے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔"

آمی کے آنسو نکل آئے۔ سسکی لے کر بولی ــــ "مجھ سے غلطی ہوئی کہ اُس سے یہ نہ پوچھا کہ وہ کہاں جائے گا .... وہ آئے گا۔ مجھے امید ہے کہ آئے گا۔"

اس سے یہ یقین ہوگیا کہ ڈکیت واقعی اسے اپنا ٹھکانہ نہیں بتا گیا۔ آمی کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔ گھوش کا دماغ بڑا اچھا تھا۔ اُس نے مجھے اور مغیث الدین سے کہا کہ تم دونوں اسی وقت آمی کے گاؤں جاؤ اور سرکار سے کہو کہ ڈکیت آئے گا۔ وہ آئے تو سرکار اُسے کہے کہ آمی مزارعوں اور کسانوں کے جھونپڑوں میں گئی ہے اور وہ اُسے بلاتا ہے۔ ڈکیت کو گھر بٹھا کر سرکار دوڑتا ہوا چوکی آکر اطلاع دے۔ گھوش نے ہمیں یہ بھی کہا کہ ہوسکتا ہے ڈکیت آ ہی گیا ہو۔ اُس نے سرکار کے ساتھ بھی تو دوستی بنا رکھی تھی۔ اگر وہ آگیا ہو تو اُسے پکڑ لیا جائے۔

ہم دونوں آمی کے گاؤں گئے۔ صبح ہونے والی تھی۔ سرکار کو جگایا۔ وہ گھر میں اکیلا تھا۔ اُس نے بتایا کہ ڈکیت نہیں آیا۔ ہم نے اُسے وہ باتیں سمجھائیں جو گھوش نے ہمیں بتائی تھیں۔ سرکار کے دل میں ڈکیت اور آمی کے خلاف انتقام کی آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ ہمارے پروگرام پر عمل کرنے کے لیے تیار ہوگیا۔ ہم نے اُس کا حوصلہ مضبوط کیا۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ ڈکیت سے ڈرتا ہے۔ اسے اچھی طرح سمجھا کر اور اُسے پکا کرکے ہم دونوں چوکی میں آگئے۔

گھوش نے ہنس کر کہا ــــ "میں نے جیسے سوچا ہے ویسے ہوگا نہیں۔ مجھے یقین نہیں کہ وہ ڈکیت آجائے گا۔ اگر وہ آگیا تو سرکار چوہے کی طرح ڈر جائے گا اور وہی کرے گا جو اُسے ڈکیت کہے گا اور یہ بھی ہوگا کہ سرکار اُسے بتا دے گا کہ آمی چوکی میں ہے اور گمشدہ لڑکی کے زیورات اس سے برآمد ہو گئے ہیں۔"

گھوش نے اپنے تھانے کو اپنی کارروائی کی اطلاع دے دی اور ڈکیت کی تلاش کے لیے تھانے کی مدد مانگی۔ تھانہ انچارج نے یہ کام اپنے ذمے لے لیا۔

اُسی رات کا واقعہ ہے کہ چوکی میں ایک آدمی آیا۔ وہ جھکا ہوا تھا، اس لیے ہم پہچان نہ سکے کہ کون ہے۔ اُس کے کندھوں پر ایک آدمی تھا جس کا سر ایک کندھے کی طرف اور ٹانگیں دوسرے کندھے کی طرف لٹک رہی تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے پاس مغیث الدین بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے بنگالی زبان میں گالی دے کر اردو میں کہا ــــ "لو، ایک اور کیس لکھو، یہ لاش لایا ہے۔"

اس آدمی نے کندھوں پر اٹھائے ہوئے آدمی یا لاش کو یوں پھینکا جیسے بوری ہو۔ وہ خود سیدھا نہ ہوسکا۔ گر پڑا اور پیٹھ کے بل لیٹ گیا۔ اُس کی سانسیں اکھڑی ہوئی تھیں۔ ہم نے قریب جا کر دیکھا تو ہمیں یقین نہ آیا۔ یہ آدمی سرکار تھا اور جسے وہ اٹھا کر لایا تھا وہ اُس کی بیوی کا دوست ڈکیت تھا۔ ڈکیت بے ہوش تھا۔ گھوش آگیا۔ اُس نے ڈکیت کو پہچان لیا۔ اُسے اُس نے پہلے کئی بار دیکھا تھا۔ سرکار کی حالت بہت بُری تھی۔ وہ ڈکیت کو بہت دور سے اُٹھا کر لایا تھا۔ اُس کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔

سرکار کے سنبھلنے سے پہلے ڈکیت ہوش میں آگیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے سر کو زور سے جھٹکا دیا۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُسے چوکی اور پولیس نظر آئی تو اُس کا منہ کھل گیا۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھا اور اچانک بھاگ اٹھا۔ ہم سب اُس کے پیچھے بھاگے۔ مغیث ہم سب سے پہلے اُس تک پہنچا اور اُس کے ٹخنے پر لات ماری تو ڈکیت اوندھے منہ گرا۔ اُسے چوکی میں لے آئے۔

"بھائی تم آمی سے ملنے آئے تھے نا!" ــــ گھوش نے اسے کہا ــ "آؤ تمہاری ملاقات کرادیں۔"

گھوش نے اُسے حوالات کے سامنے جا کھڑا کیا جہاں آمی بند تھی۔ آمی سلاخوں کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ اُس کے منہ سے کوئی بات نہ نکلی۔ ڈکیت نے اُسے کہا ــــ "یہ اس (سرکار) نے کیا ہے۔ یہ اب زندہ نہیں رہے گا۔"

سرکار اُسے جس طرح بے ہوشی کی حالت میں چوکی میں لایا تھا، یہ ایک معجزہ تھا اور بڑا ہی دل چسپ۔ یہ گھوش کی عقلمندی تھی کہ اُس نے مجھے اور مغیث کو سرکار کے پاس یہ طریقہ بتانے کے لیے بھیج دیا تھا کہ ڈکیت آئے گا اور سرکار کسی بہانے چوکی اطلاع دے دے۔ یہ طریقہ کامیاب ہوتا نظر نہیں آتا تھا جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ چوکی دو میل دُور تھی۔ یہ فاصلہ ٹیکریوں، جنگل اور جگہ جگہ پانی کی وجہ سے چار میل جتنا ہو جاتا تھا۔ واقعہ اس طرح ہُوا کہ سورج غروب ہوتے ہی ڈکیت سرکار کے گھر آگیا۔ سرکار نے اُسے کہا کہ آمی ذرا دُور کے جھونپڑوں کو نکل گئی ہے، وہ اُسے بلا لاتا ہے۔ وقت ذرا زیادہ لگ جائے گا کیونکہ جگہ دور ہے اور بہت سی عورتیں وہاں جمع ہوں گی۔ وہاں سے آمی اتنی جلدی اٹھے گی نہیں۔

سرکار بالکل اس طرح جس طرح ہم اُسے سمجھا آئے تھے، بہت تیز چوکی کی طرف چل پڑا۔ اُس نے آدھا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ وہ تنگ سی پگڈنڈی پر آرہا تھا۔ اُسے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی آواز سُنائی دی۔ وہ چلتا گیا۔ پیچھے والا آدمی اور تیز چلنے لگا اور سرکار کے قریب آکر بولا ــــ "ٹھہر سرکار! جا کہاں رہا ہے؟"

یہ آواز ڈکیت کی تھی۔ وہ عادی مجرم تھا۔ کچا آدمی نہیں تھا۔ سرکار کے پیچھے چل پڑا تھا تاکہ وہ دھوکہ دینا چاہے تو کامیاب نہ ہو سکے۔

سرکار رُک گیا۔ ڈکیت نے اُس کے منہ پر تھپڑ مارا اور کہا ــ "واپس چل۔ آمی کو آ لینے دے۔ میں تجھے وہی سزا دوں گا جو تمہیں بتائی تھی۔ چوکی جا رہا تھا تُو؟"

سرکار کو ہم سب بُزدل سمجھتے تھے۔ اُس کی بُزدلی دراصل غریبی اور کسمپرسی تھی۔ اُس کے سینے سے انتقام کا شعلہ نکلا۔ اُس کے ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈہ تھا۔

اُس نے ڈنڈہ استعمال کرنے کی بجائے ڈکیت کے پیٹ میں گھونسہ مارا۔ ڈکیت دُہرا ہو گیا۔ سرکار نے پوری طاقت سے اُس کے سر کے بالائی اور ذرا پچھلے حصّے پر ڈنڈا مارا۔ یہ جگہ ایسی ہوتی ہے کہ ہلکی سی بھی ضرب پڑے تو طاقتور انسان بھی بیہوش ہو جاتا ہے۔ ڈکیت چکرا کر گرا۔ سرکار نے دیکھا کہ وہ ہِل نہیں رہا تو اُس نے اُسے کندھوں پر اٹھا لیا اور چوکی کی طرف چل پڑا۔ وہ محنت مزدوری کرنے والا آدمی تھا۔ اپنی طاقت سے زیادہ وزن اٹھائے ہوئے چلتا گیا۔ چوکی سے تھوڑا ہی دور ڈکیت کے جسم نے حرکت کی۔ وہ ہوش میں آرہا تھا۔ سرکار نے اسے نیچے پھینک دیا۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھا۔ سرکار نے اُس کے سر کے اُسی مقام پر ڈنڈے کی شدید ضرب لگائی۔ وہ پھر بے ہوش ہو گیا۔ سرکار اُسے اٹھا کر چوکی لے آیا لیکن تھکن نے اُسے بھی ہوش میں نہیں رہنے دیا تھا۔

گھوش نے ہمیں کہا ــــ "اگر انسان کچھ کرنے کا ارادہ کر لے تو اُس کے اندر بہت طاقت ہوتی ہے۔"

گھوش نے ڈکیت سے پوچھا ــــ "لڑکی کی جان کی قربانی دی جا چکی ہے؟"

"کون سی لڑکی کی قربانی؟" ــ اُس نے جواب دیا ــــ "مجھے معلوم نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔"

"آمی میرے پاس ہے" ــ گھوش نے کہا ــــ "لڑکی کے جھمکے اور انگوٹھی میرے پاس ہے۔ اگر لڑکی زندہ ہے تو ہمیں دے دو صرف اغوا کی سزا ملے گی۔ اگر لڑکی نہ ملی تو قتل میں سزائے موت پاؤ گے۔"

وہ اپنے آپ کو استاد سمجھتا تھا لیکن گھوش زیادہ استاد تھا۔ ڈکیت نے اُسے گمراہ کرنے کی کوشش کی۔ گھوش نے اُسے ایسا گھیرا کہ ڈکیت مان گیا۔ ڈکیت نے کچھ وعدے لیے جو گھوش نے دے دیئے۔ ان میں ایک وعدہ یہ تھا کہ لڑکی برآمد ہونے کے بعد گھوش ڈکیت کے لیے حراست سے فرار ہونے کا موقعہ پیدا کر دے گا۔

یہ جُھوٹا وعدہ تھا۔

"لڑکی ابھی زندہ ہے" ــ ڈکیت نے کہا ــــ "جس رات چاند پورا ہو

گا اس رات اُس کا سر کاٹا جائے گا۔"

چاند پورا ہونے میں ابھی کچھ دن باقی تھے۔ گھوش نے اُس سے پوچھا کہ لڑکی کہاں ہے۔ اُس نے ایک جگہ بتائی جو آسام کے شمال میں جنگلی اور پہاڑی علاقہ تھا۔ یہ جگہ ہماری چوکی سے بیس میل کے لگ بھگ تھی۔ اُس نے بتایا کہ جنگلوں میں رہنے والے فقیر لڑکی پر ہر رات کچھ پڑھتے ہیں۔ یہ سلسلہ چاند کی چودھویں تک ختم ہو جائے گا۔ اُس رات لڑکی کا سر کاٹ کر فقیر لے جائیں گے اور اُس کا کلیجہ شیر کی کچھار میں پھینک دیا جائے گا۔ باقی جسم دریا میں بہا دیا جائے گا۔

تھانے سے پولیس پارٹی کا انتظام کیا گیا۔ گھوش پارٹی کمانڈر تھا۔ میں بھی اس پارٹی میں شامل تھا۔ ہم سب رائفلوں سے مسلح تھے۔ گھوش کے پاس ریوالور تھا۔ پارٹی اس طرح روانہ ہوئی کہ منزل پر رات کو پہنچے ... ہم بڑے اچھے وقت پہنچے۔ دو پہاڑیوں کے درمیان ہموار جگہ تھی۔ دہاں درخت وغیرہ تھے۔ ڈکیت کی رہبری میں ہم اُس جگہ پہنچے اور رُک گئے۔ آگ جل رہی تھی جس کی روشنی کافی تھی۔ چھ ننگ دھڑنگ آدمی ایک دائرے میں ایک دوسرے کے پیچھے اُچھل اُچھل کر چل رہے تھے اور کچھ گنگنا رہے تھے۔ ان کے درمیان کوئی بیٹھا ہُوا تھا۔ ڈکیت نے بتایا کہ وہ لڑکی ہے۔

گھوش نے پارٹی کو پھیلا کر آگے بڑھایا۔ ان آدمیوں کو اُس وقت خبر ہوئی جب ہم انہیں گھیرے میں لے چکے تھے۔ گھوش کے للکارنے پر وہ رُک گئے۔ گھوش ریوالور ہاتھ میں لیے اُن کے قریب گیا۔ پھر ہم سب رائفلیں آگے کیے آگے چلے گئے۔ ان میں سے ایک نے ہمیں یہ کہہ کر ڈرا دیا کہ کالی دیوی تم سب کو اندھا کر دے گی اور تمہاری بیویوں، بہنوں، بیٹیوں اور ماؤں کے ہاں کبھی بچہ پیدا نہیں ہوگا۔ انہوں نے کچھ اور دھمکیاں بھی دیں۔

درمیان میں لڑکی بالکل برہنہ شیر کی کھال پر بیٹھی تھی۔ اُس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ وہ وجد کی حالت میں آہستہ آہستہ سر ہلا رہی تھی۔ تمام آدمیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ جب لڑکی کو گھوش اٹھانے لگا تو لڑکی نے اوپر دیکھا اور قہقہے لگانے لگی۔ اُس کی یہ حالت بتاتی تھی کہ اسے کوئی نشہ آور چیز دی گئی ہے۔ یہ آدمی قریب ہی ایک غار میں رہتے تھے۔ اس میں سے لڑکی کے کپڑے برآمد ہوئے جو بڑی مشکل سے اسے پہنائے گئے۔ وہ کپڑے نہیں پہنتی تھی۔ غار سے جو چیزیں برآمد ہوئیں ان میں نشہ آور پانی بھی تھا جو لڑکی کو پلایا جاتا تھا۔

سب کو چوکی میں لے آئے۔ یہ ننگ دھڑنگ آدمی عدالت میں بھی پولیس کو کوستے رہے کہ اُن کے مذہب کی توہین کی گئی ہے۔ لڑکی دو روز بعد ہوش میں آئی۔ اُسے اتنا ہی یاد تھا کہ ایک آدمی اُسے اٹھا کر لے گیا تھا اور ان آدمیوں نے اسے پانی پلایا تھا۔ اس کے بعد اُسے کچھ یاد نہیں آتا تھا۔

ڈکیت کو دس سال، آمی کو پانچ سال اور ان ننگے قبائلیوں میں سے ہر ایک کو سات سات سال سزائے قید دی گئی اور سرکار کو نقد انعام اور سند ملی تھی۔



دوسری شادی کے بعد

تھانہ لالہ موسیٰ میں جب تھانہ گجرات کا اشتہارِ شوروغوغا پہنچا تو تھانے کے عملے کے بعض افراد نے کہا کہ ہرالا پتہ نہیں ہوا قتل کر دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے میں آپ کو یہ بتا دوں کہ اشتہارِ شوروغوغا کیا ہوتا ہے۔ کسی تھانے میں کسی کی گمشدگی کی رپورٹ آتی ہے اور گمشدہ فرد کا کچھ پتہ نہیں چلتا تو متعلقہ تھانے سے اردگرد کے تھانوں کو گمشدہ فرد کے متعلق معلومات اور دیگر رپورٹ لکھ کر بھیجی جاتی ہے۔ اس نوٹس پر تمام تھانے تلاش میں مدد دیتے ہیں۔ بعض کیسوں میں ملزم مفرور ہوں یا تفتیش میں بہت دشواری ہو تو بھی اردگرد کے تھانوں کو نوٹس بھیجا جاتا ہے جسے انگریزی میں HUE AND CRY NOTICE کہتے ہیں۔ اس کا اردو ترجمہ اشتہارِ شوروغوغا کیا گیا ہے۔

ہمارے تھانے میں ایک شخص ہرا جس کا پورا نام ہردین تھا، کی گمشدگی یعنی مفقود الخبری کے متعلق اشتہارِ شوروغوغا آیا تھا۔ میں اس شخص کو شکل سے پہچانتا تھا۔ وہ علاقے کا مشہور آدمی تھا لیکن اُس کی شہرت نیک نامی کی نہیں تھی۔ وہ اپنے آپ کو چوہدری ہردین گوجر کہلاتا تھا۔ سکنہ گندرہ کلاں تھانہ صدر گجرات کا رہنے والا تھا۔ ہوشیار، چالاک اور بدمعاشوں میں شمار ہوتا تھا۔ اپنی برادری میں زیادہ بدنام تھا۔ یہ بھی پتہ چلا تھا کہ نقصِ امن میں اُس کی ضمانت ہو چکی تھی۔

اس کے متعلق مزید معلومات ملیں۔ وہ وکیلوں کی منشی گیری کرتا تھا۔

جاؤ، میں طلاق نہیں دیتا۔ لڑکی والے مجبور تھے۔ وہ زبردستی طلاق نہیں لے سکتے تھے مگر دیہات کے لوگ اتنی جلدی اپنا سر نیچا نہیں کیا کرتے۔

اب ہمیں اُس کی گمشدگی کا نوٹس ملا تو ہمارے عملے کے بعض افراد نے خیال ظاہر کیا کہ ہرا گم نہیں ہُوا بلکہ اُسے گم کر کے قتل کیا گیا ہوگا۔ اس نوٹس کی موصولی کے کچھ دن بعد کا واقعہ ہے کہ میں ایک سرکاری کام سے ایک گاؤں گیا۔ وہاں دخل دلوانا تھا۔ سڑک پر ایک لاری رُکی۔ اس میں سے دو کانسٹیبل اُترے۔ اُن کے ساتھ موضع لیسوال کا ذیلدار چوہدری لال خان بھی لاری سے اُترا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ سانسی قوم کے آدمی کتّوں سے گیدڑ کا شکار کھیل رہے تھے۔ وہ ایک ویران کنوئیں کے قریب رُکے۔ انہیں بہت بُری بدبُو آئی۔ ان میں سے کسی نے کنوئیں میں جُھک کر دیکھا۔ پانی پر ایک بوری تَیر رہی تھی۔

ان لوگوں کو شک ہُوا کہ بوری میں لاش ہے۔ انہوں نے لال خان ذیلدار کو اطلاع دی۔ لال خان نے نمبردار اور چوکیدار کو ساتھ لیا اور کنوئیں پر جا کر بوری نکلوائی۔ یہ ایک نہیں دو بوریاں تھیں جو منہ کی طرف سے آپس میں سلی ہوئی تھیں۔ ایک طرف سے بوری پھاڑی تو انسانی پاؤں نظر آتے۔ دوسری طرف کی بوری پھاڑی تو انسانی سر نکلا۔ لاش کو دوہرا کر کے ایک بوری میں نہیں ڈالا گیا تھا۔ لاش بالکل سیدھی تھی اور اس پر دونوں طرف سے ایک ایک بوری چڑھا کر دونوں کے منہ سلائی سے جوڑ دیئے گئے تھے۔ لاش بہت سُوج گئی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ بہت دنوں سے کنوئیں میں پڑی ہے۔ سُوجنے کی وجہ سے ہی پانی کی سطح پر آ گئی تھی۔ تازہ لاش ڈوب جاتی ہے اور چند دنوں بعد تیرنے لگتی ہے

میں دونوں کانسٹیبلوں اور دو ذیلداروں کو ساتھ لے کر اپنے تھانے میں گیا۔ وہاں ہمارے سب انسپکٹر صاحب نہیں تھے۔ لاش کے متعلق ساری کارروائی مجھے کرنی تھی۔ لال خان ذیلدار نے اس شک کا بھی اظہار کیا کہ لاش اچھی طرح پہچانی نہیں جاتی لیکن ہرا کی معلوم ہوتی ہے۔

میں اس سے پہلے اپنے عملے سے سن چکا تھا کہ ہیرا لاپتہ نہیں ہُوا اُسے قتل کر دیا گیا ہو گا۔ اگر وہ قتل ہی ہُوا تھا اور اگر کنوئیں سے برآمد ہونے والی لاش ہیرا کی ہی تھی تو فوری طور پر یہ خیال آتا تھا کہ اُسے اس لڑکی والوں نے قتل کیا ہے جنہیں اس نے دھوکہ دیا ہے۔ پھر یہ خیال بھی آتا تھا کہ ہیرا نے معلوم نہیں کس کس کو دھوکے دیئے ہیں۔ ان میں سے کسی نے اُسے قتل کر دیا ہے۔ مگر پہلے تو یہ دیکھنا تھا کہ یہ لاش ہیرا کی ہے یا کسی اور کی۔

یہ کنوآں کوٹلہ قاسم خان کے رقبے میں تھا۔ ہمارے تھانے میں ایک کانسٹیبل چوہدری راجہ خان ہیرا کا حقیقی بھانجا تھا۔ میں نے تھانے میں اپنے پہلے کام کی واپسی اور لاش کی برآمدگی کے موقعہ پر جانے کی روانگی ڈالی اور کانسٹیبل راجہ خان کو شناخت کے لیے ساتھ لے کر روانہ ہو گیا۔ میرے ساتھ پہلے دو کانسٹیبل اور دو ذیلدار تھے۔ میں نے ہیرا کو ایک دو دفعہ دیکھا تھا۔ میں جب موقعہ پر پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ لالٹین منگوائی۔ لاش ابھی تک بوریوں میں تھی۔ ایک طرف پاؤں اور دوسری طرف سر نظر آ رہا تھا۔ لاش بوریوں سے نکلوائی تو یہ بالکل برہنہ تھی یعنی جسم پر کوئی کپڑا نہیں تھا۔

میں تو چہرہ بالکل نہ پہچان سکا۔ مقتول کے حقیقی بھانجے نے شک میں کہا کہ یہ اُس کے ماموں کی لاش ہے۔ میں نے لاش کا نظری معائنہ کیا۔ جسم پر کوئی چوٹ اور زخم نہیں تھا۔ گردن کے اردگرد ایک نشان بالکل صاف تھا۔ ایسے نشان کو پولیس والے اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ یہ رسّی کا نشان تھا جس سے مقتول کا گلا گھونٹا گیا تھا۔ اس نشان سے

یہ کہانی بنتی تھی کہ رسّی سے پھانسی دی گئی پھر جُرم کو چھپانے کے لیے لاش کو بوریوں میں بند کر کے ویران کنوئیں میں پھینک دیا۔

میں نے لاش لاری میں پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی۔ اس کے ساتھ کانسٹیبل راجہ خان کو روانہ کیا گیا جو ہیرا کا بھانجا تھا۔ میں نے یہ تجویز

بھی ساتھ لکھ دی کہ اگر لاش شناخت نہ ہو سکے تو اس کا فوٹو لیا جائے اور انگلیوں کے نشان بھی لیے جائیں لیکن ایسی ضرورت پیش نہ آئی کیونکہ گجرات میں ہیرا کے وارثوں نے لاش کو شناخت کر لیا اور یہ یقین ہو گیا کہ یہ لاش ہیرا کی ہی ہے اور گردن پر رسّی کے نشان سے ثابت ہُوا کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ یہ نشان نہ ہوتا تو بھی یہ قتل کی ہی واردات تھی کیونکہ یہ دو بوریوں میں بند کر کے کنوئیں میں پھینکی گئی تھی۔

مقتول کے وارث اُس کے بھانجے کانسٹیبل راجہ خان کی اطلاع پر فوراً ہسپتال پہنچ گئے تھے اور لاش کی شناخت ہو گئی۔ مقتول کی گمشدگی کی رپورٹ تھانہ صدر گجرات میں درج تھی۔ یہ اس طرح درج کرائی گئی تھی کہ مقتول کچھ دن نظر نہ آیا۔ کچہری بھی نہ گیا۔ اس سے کچھ شک ہُوا۔ اتنے میں ایک آدمی جو مقتول کا دوست تھا، سامنے آیا۔ اُس نے بتایا کہ ہیرا کو اُس کے سُسرال نے اپنے گاؤں بلایا تھا اور وہ اپنے اس دوست کو بھی ساتھ لے گیا تھا کیونکہ ہیرا کو شک تھا کہ سُسرال والے اس کے ساتھ کوئی گڑبڑ کریں گے۔ اس آدمی نے بتایا کہ سُسرال نے ہیرا کو اندر سُلایا اور دوست کو باہر جگہ دی تھی۔

دوسرے دن اس دوست کو ہیرا کے سُسر نے بتایا کہ ہیرا علی الصبح کسی ضروری کام کے لیے جلدی میں گاؤں چلا گیا ہے اور کہہ گیا ہے کہ میرے دوست کو کہنا کہ میں اسے بہن کے گھر سے بلا لوں گا۔ دوست کو کچھ شک گزرا۔ وہ فوراً ہیرا کے گاؤں کو روانہ ہو گیا۔ راستے میں اُسے جان پہچان کے دو آدمی ملے جو مویشیوں کے لیے چارہ کاٹ رہے تھے۔ دوست نے اُن سے پوچھا کہ انہوں نے ہیرا کو ادھر سے گزرتے دیکھا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ ہاں، دیکھا ہے۔ ہم سے سلام دعا لے کر گیا ہے۔ دوست کچہری گجرات چلا گیا۔ ہیرا وہاں نہیں تھا۔ وہاں اسے ہیرا کے سُسرال کے رشتے کا ایک آدمی ملا۔ دوست نے اُسے کہا کہ ہیرا کہیں نظر نہیں آ رہا۔ اس آدمی نے اُسے بتایا کہ اُس نے ہیرا کو ابھی ابھی ایک عورت کے ساتھ دیکھا ہے۔

یہ عورت شاید مؤکل تھی۔

ہَرا کا اس طرح لاپتہ ہو جانا عجیب بات نہیں تھی۔ وہ عورت نہیں تھی اور وہ بچّہ بھی نہیں تھا کہ کوئی اُسے ورغلا کر اغوا کر کے لے گیا ہوگا۔ ہَرا ایسی قماش کا آدمی تھا کہ کسی بدمعاشی کے سلسلے میں کہیں چلا گیا ہوگا، لیکن اس کے دوست کو معلوم تھا کہ سسرال ہَرا کے دشمن ہو گئے ہیں کیونکہ اُس نے انہیں دھوکہ دیا ہے۔ اُن دنوں یہ لڑکی جس کے ساتھ ہَرا نے دھوکے سے شادی کی تھی اپنے میکے میں تھی۔ لڑکی کے والدین نے ہَرا کو بلایا تھا۔ اس سے اُس کے دوست کو پختہ شک ہو رہا تھا کہ ہَرا کو اُس کے سسرال نے غائب کر دیا ہے اور ہو سکتا ہے اسے قتل بھی کر دیا گیا ہو۔

دوست نے سوچا کہ ہَرا اُسے اپنے سُسرال لے گیا تھا۔ اُسے آخر ایسا ضروری کام کیا آپڑا تھا کہ اُسے بتائے بغیر چلا گیا اور کہہ گیا کہ وہ اُسے اس کی بہن کے گھر سے بُلا لے گا۔ اس سے اُسے شک ہُوا، مگر کھیتوں میں دو آدمیوں نے اُسے بتایا کہ ہَرا اُن کے قریب سے گزر کر اور سلام دعا لے کر گیا ہے، پھر کچہری میں اُسے ایک آدمی نے بتایا کہ اُس نے ہَرا کو ایک عورت کے ساتھ دیکھا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ہَرا سُسرال سے خیریت سے آگیا ہے مگر دوست کو یہ خیال آیا کہ کھیتوں میں اُسے جو دو آدمی ملے تھے وہ ہَرا کے سسرال کے قریبی رشتہ دار تھے اور اُسے کچہری میں جو آدمی ملا تھا وہ بھی ہَرا کے سسرال کا آدمی تھا۔ یہ آدمی اپنے آپ ہَرا کے دوست کے سامنے آگیا تھا۔ اس سے اُسے کچھ شک ہُوا۔ ہَرا کے سسرال کی ساری برادری اُس کی دشمن ہو گئی تھی۔ دیہاتی علاقے میں ایک آدمی کے جُرم کو ساری برادری مل کر چُھپا لیتی ہے اور اس سے پولیس کے لیے بہت بڑی مشکل پیدا ہو جاتی ہے۔

اس دوست نے اُس وکیل کے ساتھ بات کی جس کا ہَرا منشی اور ایجنٹ تھا۔ وکیل نے دوست کی ساری بات سُنی تو اُسے بھی شک ہُوا بلکہ وکیل نے یہ رائے دی کہ ہَرا قتل کر دیا گیا ہے۔ اُس روز کچہری میں ہَرا کو نہ اس وکیل نے دیکھا نہ کسی اور وکیل نے۔ وہ کسی عورت کو ساتھ لیے کسی بھی وکیل کے

پاس نہیں گیا تھا۔ چنانچہ وکیل نے ہَرا کے دوست کو ساتھ لیا اور تھانہ صدر چلے گئے۔ انہوں نے رپورٹ یہ دی کہ ہَرا قتل کر دیا گیا ہے اور شک سُسرال پر ہے۔ تھانہ انچارج نے قتل کی رپورٹ درج کرنے سے گریز کیا اور وجہ یہ بتائی کہ قتل کی ابھی کوئی شہادت اور کوئی اشارہ موجود نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم قتل کا پرچہ کر دیں تو ہَرا زندہ واپس آجائے۔

وکیل نے بہت بحث کی اور تھانیدار کو قائل کرنے کی پوری کوشش کی کہ پرچہ ۳۰۲ (قتل) کا ہونا چاہیے لیکن تھانیدار ہَرا کو جانتا تھا کہ وہ کس قماش کا آدمی ہے۔ اُس نے کہا کہ دو گواہ کہتے ہیں کہ انہوں نے کھیتوں میں ہَرا کو سُسرال سے جاتے دیکھا ہے اور پھر ایک آدمی ہَرا کی موجودگی کچہری میں بیان کرتا ہے لہٰذا رپورٹ مفقود الخبری کی درج ہو گی۔ آخر اس سب انسپکٹر نے مفقود الخبری (گمشدگی) کی رپورٹ درج کی اور اپنے طور پر اُسے جو تفتیش کرنی تھی، کی اور جب کچھ دن گزر گئے اور ہَرا کا کوئی سراغ نہ ملا تو سب انسپکٹر نے اِردگرد کے تھانوں میں اشتہارِ شور و غوغا بھجوا دیا۔

اب لاش مل گئی اور شناخت بھی ہو گئی کہ ہَرا کی ہے تو قتل کی تفتیش شروع ہو گئی۔ واردات دوسرے تھانے کی تھی لیکن لاش میرے تھانے سے برآمد ہوئی تھی اس لیے تفتیش دونوں تھانوں کو مل کر کرنی تھی۔ تھانہ صدر گجرات کا اسسٹنٹ سب انسپکٹر میاں غلام قادر میرے ساتھ تفتیش کے لیے مقرر ہُوا۔ ہم نے پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھی۔ موت کا باعث گردن کے گرد رسّی لپیٹنے اور دونوں طرف سے رسّی کھینچنے سے لکھا گیا تھا۔ ایک ضرب شدید سر پر تھی جو مجھے نظر نہیں آئی تھی۔ اس میں سے خون نہیں نکلا تھا۔ ڈاکٹر نے لکھا تھا کہ کھوپڑی میں کریک ہے، یعنی ذرا سی ٹوٹی ہوئی ہے۔

تفتیش موضع پسوال میں وہاں کے ذیلدار چوہدری لال خان کے دائرہ میں شروع ہوئی۔ دائرہ ایک کشادہ حویلی ہوتی ہے جس کے کئی کمرے ہوتے ہیں۔ دائرہ گاؤں میں ماتم اور شادی کے مہمانوں کو ٹھہرانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ گاؤں کے ہر ایک گھرانے کے استعمال کے لیے ہوتا ہے۔

پسوال میں ذیلدار کا دائرہ تھا۔ ہم نے وہاں جا ڈیرے لگائے۔ اتنے میں میرے تھانے کے انچارج سب انسپکٹر خان محمد ایوب خان بھی پہنچ گئے۔

قتل کا پہلا شبہ مقتول کے سُسرال پر تھا۔ انہیں بلا لیا گیا اور شاملِ تفتیش کیا گیا۔ ہَرا کی دوسری بیوی کے دو ماموں بھی بلائے گئے۔ مخبروں کی اطلاع کے مطابق انہیں قتل کی رات مشکوک حالت میں ایک جگہ دیکھا گیا تھا۔ ان تمام افراد کو دائرہ کے الگ الگ کمروں میں رکھا گیا تاکہ آپس میں بات چیت نہ کر سکیں۔ ہر ایک کو اکیلے اکیلے تفتیش کے لیے ہم نے اپنے کمرے میں بلانا شروع کیا۔ ہم نے دیکھا کہ ان میں سے ہر ایک آدمی پختہ دماغ کا تھا۔ ذرا غور کریں کہ تفتیش کرنے والے تین تجربہ کار آدمی تھے۔ ایک سب انسپکٹر، ایک اسسٹنٹ سب انسپکٹر اور ایک میں جو ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ تین آدمیوں کی جرح سے ان میں سے کوئی بھی گھبراتا اور ڈرتا نہیں تھا۔

ہم نے یہ دیکھ لیا کہ یہ لوگ مشتبہ نہیں ملزم ہیں۔ وہ کتنی ہی چالاکی کیوں نہ کرتے، یہ قدرتی بات ہے کہ ایک سے زیادہ افراد جب ایک ہی واقعہ کے متعلق بیان دیتے یا جھوٹ بولتے ہیں تو کہیں نہ کہیں فرق اور اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ تفتیشی افسر اس ذرا ذرا سے فرق اور اختلاف کو نوٹ کر لیتے ہیں۔ یہ بات بھی یاد رکھیں کہ جُرم خود بولتا ہے۔ انسان جُرم کو ہضم نہیں کر سکتا۔ ان لوگوں میں بھی ایسا اختلاف پایا جاتا تھا جس سے یہ شک پختہ ہو گیا کہ یہ واردات اسی برادری کی ہے۔ اب یہ معلوم کرنا تھا کہ قتل کا مجرم کون ہے اور قتل کس طرح کیا گیا مگر ان میں کوئی بھی اقبالی بیان کا نام نہیں لیتا تھا۔

ہم نے تفتیش کا دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ اکیلے اکیلے کو کمرے میں بلا کر تشدد شروع کر دیا۔ ہم نے یہ طریقہ بھی ناکام ہوتے دیکھا تو پریشان ہو گئے۔ ہر ایک کو سلطانی گواہ بننے کا لالچ دیا جو کسی نے بھی قبول نہ کیا۔ ہمارے عملے میں فیروز خان نام کا ایک کانسٹیبل تھا جسے تفتیش اور سراغ رسانی کا جیسے پیدائشی تجربہ حاصل تھا۔ اُسے سب انسپکٹر خان محمد ایوب خان

اپنے ساتھ لائے تھے۔ اُس نے مقتول کے سُسرال کے جو افراد بُلائے گئے تھے ان میں ایک نو عمر لڑکا دیکھ لیا جو مقتول کی بیوی کا چھوٹا بھائی تھا۔ فیروز خان نے کہا کہ اس لڑکے کو اُس کے حوالے کر دیا جائے۔ یہ لڑکا اُس کے حوالے کر دیا گیا۔

دائرہ میں ایک کمرہ تھا جس میں چارپائیاں جمع کی ہوئی تھیں۔ یہ مہمانوں کے استعمال والی چارپائیوں کا سٹور بنا ہوا تھا۔ فیروز خان اس لڑکے کو اس کمرے میں لے گیا اور کمرہ اندر سے بند کر دیا۔ فیروز خان نے پورے یقین سے کہا تھا کہ وہ قاتل کا سراغ لگا لے گا۔ اُس نے لڑکے کے بازو ایک کھڑی چارپائی کے اُوپر والے پایوں کے ساتھ پھیلا کر باندھ دیئے اور ٹانگیں ٹخنوں سے رسّیاں باندھ کر نیچے والے پایوں کے ساتھ کس کر باندھ دیں۔ فیروز خان ایک چارپائی بچھا کر اس پر لیٹ گیا اور لڑکے سے کہا کہ جب بتا دو گے کہ ہَرا کو کس نے قتل کیا ہے تو تمہیں کھول دوں گا۔

لڑکا بہت ہی تکلیف دہ پوزیشن میں لٹک رہا تھا۔ وہ بہت بُری اذیت میں مبتلا تھا جب اُس کے کندھوں اور بازوؤں کے جوڑ شدید درد کرنے لگے تو وہ چیخنے چلانے لگا۔ فیروز خان نے اُسے کہا کہ جتنا چیخ سکتے ہو چیخو، چاہے مر جاؤ، چھوڑوں گا اُس وقت جب ہَرا کے قاتل کا نام بتا دو گے۔ فیروز خان کو یقین ہو گیا تھا کہ ہَرا کو سُسرال نے ہی قتل کیا ہے اور اس لڑکے کو معلوم ہے لیکن لڑکا اذیت اور درد کی شدّت سے روئے اور چیخے جا رہا تھا۔

وہ آخر کم عمر تھا۔ یہ اذیت اُس کی برداشت سے باہر تھی۔ اُس نے کہا کہ اُس کے باپ کو بُلایا جائے۔ وہ اُس کے ساتھ بات کر کے بتائے گا۔ فیروز خان نے اُس کے باپ کو بلایا۔ اس کے ساتھ سب انسپکٹر، اسسٹنٹ سب انسپکٹر، ذیلدار، میں اور شاید ایک دو اور سرکاری آدمی چارپائیوں والے کمرے میں چلے گئے۔ لڑکے کو کھول دیا گیا۔ وہ تو اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اُسے کہا گیا کہ اپنے باپ کے ساتھ جو بات کرنا چاہتا ہے کر لے۔

لڑکے نے روتے ہوئے کہا کہ وہ باپ کے ساتھ تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ لڑکے کو باپ کے ساتھ تنہا چھوڑ دیا جائے۔ سب باہر نکل گئے۔ کمرے کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ لڑکے نے باپ سے کہا کہ میں اتنی اذیّت برداشت نہیں کر سکتا۔ میں یہ بھید بتا دوں گا۔ باپ نے اُس کی منّت کرتے ہوئے کہا کہ بیٹا! تم جوان آدمی ہو۔ برداشت کرو۔ یہ لوگ صرف آج رات تشدّد کریں گے، صبح تمہیں یہ سمجھ کر چھوڑ دیں گے کہ ہم بے گناہ ہیں۔ لڑکے نے کہا کہ میں اب بالکل برداشت نہیں کر سکتا، تم ساری رات کی بات کرتے ہو۔

آخر باپ بیٹے نے آپس میں صلاح مشورہ کر کے یہ کہانی گھڑ لی کہ ہَرا کی نقصِ امن میں ضمانت ہوئی تھی۔ وہ ہمارے گھر آیا تو اُس کی برادری کے کچھ لوگ اُس کی تاک میں تھے۔ ہَرا ہمارے گھر سے نکل کر جا رہا تھا تو اُس کی برادری کے آدمیوں نے اُسے پکڑ لیا اور اپنے گھر لے گئے۔ انہوں نے اُسے قتل کیا اور لاش ویران کنوئیں میں پھینک دی ——— میں نے آپ کو یہ کہانی بہت مختصر سُنائی ہے۔ انہوں نے بڑی لمبی کہانی گھڑی تھی اور شہادت مہیّا کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔

تھوڑی دیر گزری تو سب انسپکٹر خان ایّوب خان نے دروازہ کھول دیا۔ ہم سب اندر گئے۔ باپ بیٹے نے اپنی بنائی ہوئی کہانی سنانی شروع کر دی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ کانسٹیبل فیروز خان ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ معلوم نہیں کہاں چلا گیا تھا۔ باپ بیٹا اپنی کہانی ختم کر چکے تو فیروز خان آ گیا۔ میں نے دیکھا کہ کمرے میں چارپائیوں کا جو ڈھیر لگا ہُوا تھا وہ اس کے پیچھے سے آیا تھا لیکن دوسرے سب یہ سمجھے کہ وہ باہر سے آیا ہے۔ وہ اُس وقت چارپائیوں کے پیچھے چھُپ گیا تھا جب لڑکے نے کہا تھا کہ اُسے باپ کے ساتھ تنہائی میں بات کرنے دی جائے۔ کمرے میں ہم بہت سارے آدمی تھے۔ سب جب باہر نکل رہے تھے فیروز خان موقعہ دیکھ کر چارپائیوں کے پیچھے چھُپ گیا تھا اور باپ بیٹے کی تمام باتیں سنتا رہا

تھا۔ اسی نے ہمیں یہ باتیں بتائی تھیں جو میں نے آپ کو سُنائی ہیں، ورنہ ہمیں کیسے پتہ چلتا کہ بند کمرے میں باپ بیٹے کے درمیان کیا باتیں ہوئی ہیں۔

فیروز خان نے سامنے آ کر کہا کہ یہ جھوٹ بولتے ہیں۔ سب باہر چلے جاؤ اور لڑکے کو میرے پاس رہنے دو۔ چنانچہ سب باہر چلے گئے۔ لڑکے کے باپ کو بھی باہر نکال دیا گیا۔ فیروز خان نے دروازہ اندر سے بند کر دیا اور لڑکے کو پھر پہلے کی طرح کھڑی چارپائی کے ساتھ باندھ دیا۔ رات کا وقت تھا۔ لڑکے کو نیند بھی آ رہی تھی۔ اس اذیّت سے وہ پہلے ہی بہت تکلیف میں تھا۔ اب وہ چند منٹ بھی برداشت نہ کر سکا اور چیخنے چلّانے لگا اور فیروز خان سے کہا کہ خدا کے واسطے میرے باپ کو ایک بار پھر بُلا دو۔ اب میں سچّی بات بتاؤں گا۔ فیروز خان نے اُسے کہا کہ تم پھر جھوٹ بولو گے اس لیے اب تمہیں نہیں کھولوں گا۔ اب تمہاری لاش کھولی جائے گی۔

لڑکے نے منّتیں کیں، قسمیں کھائیں اور فیروز خان نے ایک بار پھر اُس کے باپ کو بُلایا اور ایک بار پھر ہم کمرے میں چلے گئے۔ لڑکے نے پہلے کی طرح باپ کے ساتھ تنہائی میں بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اُسے اجازت دے دی گئی۔ ہم سب جب باہر نکل رہے تھے فیروز خان پہلے کی طرح چارپائیوں کے پیچھے چھُپ گیا۔ باپ بیٹا آپس میں باتیں کرنے لگے جو فیروز خان سنتا رہا۔ باپ نے بیٹے سے کہا کہ تم بہت بُزدل ہو، اتنی سی تکلیف برداشت نہیں کر سکتے۔ باقی رات برداشت کر لو صبح ہوتے ہی یہ ہمیں بے گناہ سمجھ کر چھوڑ دیں گے لیکن اب بیٹے کی حالت پہلے سے زیادہ بُری تھی۔ اُس نے باپ کو غصّے سے کہا کہ تم میری جگہ آ جاؤ، میں اب سچّی بات بتا دوں گا۔ باپ سمجھ گیا کہ اب لڑکا برداشت نہیں کر سکے گا اور اُسے کچھ کہنا فضول ہے۔ اُس نے بیٹے سے کہا کہ ذیلدار سے کہتے ہیں کہ وہ تمہاری ماں اور بہن کو چھوڑ دیں تو ہم اقبالِ جُرم کر لیں گے۔

ہم نے ہَرا کی ساس اور اُس کی بیوی کو بھی دائرے میں بُلا رکھا تھا۔

ان لوگوں کو ڈر یہ تھا کہ ان کی مستورات کی بھی بے عزتی ہو گی۔ کمرے کا دروازہ کھولا گیا تو باپ نے کہا کہ اُس کی بیوی اور بیٹی کو تفتیش سے خارج کر کے گھر بھیج دیا جائے تو وہ سچی بات بتا دیں گے۔ اُس کی خواہش پر فوراً عمل کیا گیا۔ فیروز خان چارپائیوں کے پیچھے سے نکل آیا۔ باپ نے اطمینان سے اقبالِ جرم کر لیا۔

اُس نے بیان دیا کہ ہِرا نے اُس سے دھوکے میں لڑکی کا رشتہ لے لیا تھا۔ یہ ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ ہِرا نے ہمارے ذیلدار کو اور مجھے گجرات میں جو جائیداد دکھائی ہے وہ مکان اس کے نہیں بلکہ وکیلوں کے ہیں۔ یہ بھی پتہ چلا کہ ہِرا شادی شدہ ہے اور بدمعاش ہے اور نقصِ امن میں ضمانت پر ہے۔ ہم ایسی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ لوگ یہ کہیں کہ ہِرا بدمعاش ہمارا داماد ہے۔ ہم نے اُسے کہا کہ ہماری بیٹی کو طلاق دے دو۔ وہ پہلے تو جھوٹ بولتا رہا لیکن ہم اس کے پیچھے پڑ گئے تو اس نے بڑے رعب سے ہمیں کہا کہ جاؤ میں طلاق نہیں دوں گا۔

ہم ایک تو اس دھوکے کا انتقام لینا چاہتے تھے جو اُس نے ہمیں دیا اور دوسرے یہ کہ ہم اس قسم کے بدمعاش، بدنام اور نوسرباز کے ساتھ رشتہ قائم نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ ہم نے آپس میں صلاح مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ ہِرا کو اپنے گاؤں بُلا کر اُسے قتل کر دیا جائے اور لاش غائب کر دی جائے۔ اس دوران یہ واقعہ ہُوا کہ لڑکی چونکہ ہِرا کے ساتھ خوش نہیں تھی اس لیے وہ رُوٹھ کر ہمارے پاس میکے آ گئی۔ ہِرا اُسے لینے نہ آیا۔ ہم نے یہ موقعہ اچھا دیکھا اور اپنے منصوبے پر عمل کیا۔ میں نے اپنے اس بیٹے کو کچہری بھیجا کہ ہِرا کو دھوکے سے گاؤں لے آئے۔

یہ لڑکا کچہری گیا اور ہِرا سے کہا کہ مجھے اپنے ماں باپ نے یہ کہہ کر بھیجا ہے کہ جو ہونا تھا وہ ہو گیا ہے، خدا کو اسی میں بہتری منظور ہے۔ ہم نے ناراضگی دل سے نکال دی ہے۔ تم آؤ اور اپنی بیوی کو لے جاؤ — ہِرا ہمارے دھوکے میں آ گیا۔ اُس نے لڑکے سے کہا کہ تم چلو، میں پچھلے پہر کچہری سے

فارغ ہو کر آ جاؤں گا۔ ہِرا پچھلے پہر سسرال کے گاؤں چلا گیا۔ اُس کے ساتھ ایک اور آدمی تھا جو اُس کا دوست تھا۔

یہ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اس آدمی کو ہِرا اس لیے ساتھ لے گیا تھا کہ اپنے سسرال والوں پر اُسے بھروسہ نہیں تھا۔ اُسے ڈر تھا کہ یہ لوگ کوئی گڑبڑ نہ کریں۔

لڑکی کے باپ نے بتایا کہ جب یہ دونوں ہمارے گاؤں میں آئے تو ہم نے ان کی بہت عزّت کی اور دُودھ پلایا۔ انہیں ذرا سا بھی شک نہ ہونے دیا کہ ہماری نیّت کیا ہے۔ ہِرا کو ہم اندر لے گئے اور اسے کہا کہ سر ہمیشہ لڑکی والوں کو نیچا کرنا پڑتا ہے۔ ہم نے ہار مان لی ہے۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب تم ہمارے بیٹے ہو۔ لڑکی بھی مان گئی ہے ہم اسے کل صبح اپنے ساتھ لے جانا۔ میں نے اسے یہ بھی کہا کہ اپنے دوست کو اُس کی بہن کے گھر بھیج دو۔ اس آدمی کی بہن ہمارے گاؤں میں بیاہی ہوئی ہے۔ ہِرا ہمارے گھر ٹھہرا اور اُس نے اپنے دوست سے کہا کہ وہ اپنی بہن کے گھر چلا جائے اور صبح اسے وہاں سے بلا لے گا، پھر واپس چلیں گے۔ اُس کا دوست بہن کے گھر چلا گیا۔

ہِرا بہت خوش تھا کہ ہم نے اس کے آگے سر نیچا کر لیا ہے۔ وہ اپنے ساتھ گوشت، سبزی اور انگور لایا تھا۔ وہ ہم سب ہنسی خوشی کھاتے رہے۔ میری بیوی اور میری بیٹی اس کے ساتھ پیار و محبّت کی باتیں کرتی رہیں۔ رات کو میری بیوی نے اُسے ڈیوڑھی میں سُلایا اور اسے کہا کہ رات کو تمہارا سُسر اور سالا مال مویشی اندر باندھ کر سو جائیں گے تو تمہاری بیوی اپنی چارپائی تمہارے پاس لے آئے گی۔ تم ڈیوڑھی کا دروازہ اندر سے بند نہ کرنا۔ جب مال مویشی اندر آ جائیں گے تو ہم خود دروازہ بند کر لیں گے

ہِرا ہنسی خوشی سو گیا۔ میں اپنے اس بیٹے کو ساتھ لے کر موضع چورچکوڑی چلا گیا اور وہاں سے اپنی بیوی کے دو بھائیوں کو ساتھ لے آیا۔

ان کا گھوڑا بھی ساتھ لے آئے۔ گھوڑے کے ساتھ چھوٹا رسّہ تھا جس سے گھوڑے کے پاؤں باندھا کرتے ہیں۔ میرے یہ دونوں رشتہ دار میرے منصوبے میں شامل تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ شکار جال میں آگیا ہے۔

ہم جب اپنے گھر میں داخل ہوئے تو ہرا گہری نیند سویا ہوا تھا۔ میری بیوی کے بھائیوں نے گھوڑے کے پاؤں باندھنے والا رسّہ کھولا اور ڈیوڑھی میں آئے۔ انہوں نے ہرا کو اُوپر سے دبا لیا۔ میں نے اُس کا سر جکڑ لیا اور میرے اس بیٹے نے اُس کے ٹخنے پکڑ کر اُس کی ٹانگیں قابو میں کر لیں۔ اس کا ایک بازو میری بیوی نے اور دوسرا میری بیٹی نے پکڑ لیا۔

میری بیوی کے بھائیوں نے اس کی گردن کے گرد رسّہ لپیٹا۔ ایک نے ایک طرف سے اور دوسرے نے دوسری طرف سے بہت زور سے کھینچا۔ ہمیں بالکل افسوس نہیں تھا کہ ہم ایک انسان کو قتل کر رہے ہیں۔ ہم ایک فریبی اور بہت بڑے گناہگار کو ختم کر رہے تھے جس نے معلوم نہیں کتنے شریف لوگوں کو دھوکے دیئے تھے۔ وہ زندہ رہتا تو معلوم نہیں کتنے اور انسانوں کو دھوکے دیتا۔ اسے زیادہ تڑپنے کا موقع نہ ملا۔ وہ جلدی مر گیا۔ لاش کی شناخت میں گڑبڑ پیدا کرنے کے لیے ہم نے اس کے تمام کپڑے اُتار دیئے۔ اس کے ایک دو کپڑے کھونٹی کے ساتھ لٹک رہے تھے وہ بھی اُتار لیے۔ یہ تمام کپڑے میری بیوی کے بھائیوں نے اپنے پاس رکھ لیے۔ لاش پر دو بوریاں چڑھا دیں۔ ایک پاؤں کی طرف سے اور ایک سر کی طرف سے۔ دونوں بوریوں کے مُنہ سی دیئے۔ دونوں بھائیوں نے لاش اٹھا کر گھوڑے پر ڈالی اور یہ کہہ کر چلے گئے کہ نہر میں پھینک آئیں گے۔

واپس آ کر انہوں نے بتایا کہ ایک جگہ انہوں نے مقتول کے کپڑے اور جوتی وغیرہ زمین میں دبا دی اور نہر کی طرف چلے گئے۔ راستے میں ریلوے پھاٹک آتا ہے۔ وہاں لاش سر کے بل گر پڑی۔ (پوسٹ مارٹم رپورٹ میں لکھا تھا کہ کھوپڑی کی ہڈی میں کریک تھا۔ یہ لاش سر کے بل

گرنے سے آیا ہوگا)۔ نہر ابھی دُور تھی اور صبح طلوع ہونے میں تھوڑا وقت رہ گیا تھا۔ دیہات کے لوگ بہت جلدی جاگ اٹھتے ہیں۔ دونوں بھائیوں نے نہر تک جانے کا خیال چھوڑ دیا۔ انہیں معلوم تھا کہ یہاں ایک ویران کنوآں ہے۔ انہوں نے لاش کنوئیں میں پھینک دی اور واپس آگئے۔ ہم سب کو امید تھی کہ قتل کا سراغ کسی کو نہیں ملے گی۔

اُس کے اس دوست کا خطرہ تھا جو اس کے ساتھ آیا تھا۔ وہ دوسرے دن ہمارے گھر آیا تو ہم نے اُسے بتایا کہ ہرا ایک ضروری کام سے بہت سویرے اٹھ کر چلا گیا ہے۔ اس آدمی کو گمراہ کرنے کا ہم نے یہ انتظام کیا کہ اپنے دو آدمیوں کو اس آدمی کے راستے میں بھیج دیا۔ انہوں نے دیکھا کہ یہ آدمی آرہا ہے تو وہ چارہ کاٹنے لگے۔ جب یہ آدمی ان کے قریب گیا تو انہوں نے اس کے ساتھ سلام دعا کی اور باتیں کرنے لگے۔ باتوں باتوں میں ہرا کا ذکر لے آئے۔ اس آدمی نے اُن سے پوچھا کہ انہوں نے اُسے واپس جاتے دیکھا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ ہاں دیکھا ہے۔ وہ اِدھر سے ہی گزر کر واپس گیا ہے۔

ہم نے ایک آدمی ہرا کے اِس دوست کے پیچھے لگا دیا جو اُسے کچہری میں ملا۔ اُس نے بھی ہرا کے متعلق باتیں کیں اور کہا کہ اُس نے ہرا کو ابھی ابھی ایک عورت کے ساتھ دیکھا ہے۔

لڑکی کے باپ کا اقبالِ جرم مکمل تھا۔ ہم نے صبح ہوتے ہی مقتول کے کپڑے، ملزموں کا گھوڑا اور رسّہ برآمد کر لیا۔ اقبالی بیان زیر دفعہ ۱۶۴ مجسٹریٹ سے قلم بند کرایا۔ مقدمہ مضبوط کرنے کے لیے ہم نے ریلوے پھاٹک پر جو ریلوے کا آدمی ڈیوٹی پر رہتا تھا اُس کا بیان لیا کہ رات کو اُس نے ملزموں کو دیکھا کہ گھوڑے پر ایک بوری لادے پھاٹک سے گزرے اور بوری گر پڑی تھی۔ اُسے ہم نے یہ بھی یاد کرا دیا کہ وہ بیان میں کہے کہ اُس نے ملزموں سے پوچھا تھا کہ بوری میں کیا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ ان کا ایک آدمی فوج سے چھٹی لے کر آیا ہے اور یہ اُس کا

سامان ہے۔ ہم نے ایک اور آدمی کی گواہی ڈالی کہ دونوں ملزم ویران کنوئیں کی طرف سے واپس جا رہے تھے۔

ہم نے چالان تیار کر کے عدالت میں دے دیا۔ ہُوا یہ کہ سب انسپکٹر خان محمد ایوب خان کی تبدیلی آگئی اور وہ لالہ موسیٰ سے چلے گئے۔ اُدھر اے۔ ایس۔ آئی میاں غلام قادر کو سب انسپکٹر بنا کر پھالیہ بھیج دیا گیا۔ مقدمے میں دلچسپی لینے والا کوئی نہ رہا۔ سیشن کورٹ میں جا کر ملزم اپنے اقبالی بیانوں سے منحرف ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ پولیس نے سخت تشدد کر کے جھوٹے اقبالی بیان لیے ہیں۔ ملزموں نے اپنی صفائی میں وہ دو آدمی پیش کیے جو چارہ کاٹ رہے تھے اور مقتول کے متعلق انہوں نے اُس کے دوست کو بتایا تھا کہ وہ شہر چلا گیا ہے۔ صفائی کا دوسرا گواہ وہ آدمی تھا جس نے کچہری میں مقتول کے دوست سے کہا تھا کہ اس نے ہرا کو ابھی ابھی ایک عورت کے ساتھ دیکھا ہے۔

کورٹ نے تمام ملزموں کو شک کا فائدہ دے کر بری کر دیا۔



پانچ بچے ایک ماں

یہ واقعہ ۱۹۳۶ء کا ہے۔ دہلی میں فریزر نام کا ایک انگریز ڈاکٹر آیا۔ مجھے اُس کا اردلی مقرر کیا گیا۔ اس سے پہلے میں دو انگریز ڈاکٹروں کا اردلی رہ چکا تھا۔ ڈاکٹر فریزر بہت اچھا آدمی تھا۔ تین چار مہینے بعد اُسے بنگال جانے کا حکم ملا۔ میرے کام سے وہ اتنا خوش تھا کہ اُس نے مجھے اپنے ساتھ رکھنے کی اجازت لے لی۔ ہم بنگال گئے تو چٹاگانگ جانے کا حکم ملا۔ وہاں چھوٹا سا ایک سرکاری ہسپتال تھا۔ اسے بڑا ہسپتال بنانا تھا۔ ارد گرد کے دیہات کے لوگوں کے لیے بڑے ہسپتال کی ضرورت تھی۔ وہاں ایک بنگالی ہندو ڈاکٹر تھا۔ کمپونڈر بھی بنگالی تھے۔ مجھے بنگالی سیکھنی پڑی۔ اُس زمانے میں چٹاگانگ آج کل کی طرح اتنا زیادہ مشہور نہیں تھا۔ بندرگاہ کی وجہ سے وہاں آبادی بہت تھی۔ زیادہ تر لوگ ملاح اور ماہی گیر تھے۔ وہاں ہندو مسلمان میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ان لوگوں کے لیے بڑے ہسپتال کی ضرورت تھی جس کے لیے ڈاکٹر کو وہاں بھیجا گیا تھا۔

ایک روز ایک غریب سی عورت اپنے بچے کو اُٹھائے ہوئے دوڑتی آئی۔ وہ رو رہی تھی۔ بچے کی عمر مشکل سے ایک سال تھی۔ اُس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی اور وہ بہت تکلیف سے سانس لے رہا تھا۔ ڈاکٹر فریزر مجھے ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا کیونکہ وہاں میرے سوا اُس کی زبان سمجھنے والا کوئی نہیں تھا۔ ہندو ڈاکٹر گھوش انگریزی سمجھتا

تھا لیکن وہ اپنے کام میں مصروف رہتا تھا۔ آپ مجھے تعلیم یافتہ آدمی نہ سمجھیں۔ میں انگریزی لکھنا اور پڑھنا نہیں جانتا تھا، انگریزوں کے ساتھ رہ کر صرف بول اور سمجھ سکتا تھا۔

یہ بنگالی عورت اپنے بچّے کو لائی تو میں بھی ڈاکٹر فریزر کے ساتھ تھا۔ اُس نے بچّے کو دیکھا تو یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ لوگ بچوّں کو احتیاط سے نہیں رکھتے بچّے کے منہ پر کوئی کپڑا آ گیا ہو گا جس سے اس کا دم گھُٹ گیا ہے۔ ڈاکٹر نے دوائی کے دو چار قطرے بچّے کے منہ میں ٹپکائے اور سینے کو دبایا جس سے بچّے کا سانس چل پڑا۔ بچّے نے رونا شروع کر دیا۔ ماں کا رونا بند ہو گیا اور وہ بنگالی زبان میں کچھ کہنے لگی۔ ڈاکٹر فریزر نے ایک ہندو کمپونڈر کو بُلایا اور اُس سے پُوچھا کہ یہ عورت کیا کہتی ہے۔ اُس نے عورت کی باتیں سُن کر بتایا کہ وہ ڈاکٹر کا شکریہ ادا کر رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ اس سے پہلے اُس کے گھر کے ارد گرد چار بچّے اسی بیماری سے مر چکے ہیں۔

یہ سُن کر ڈاکٹر فریزر نے ہندو ڈاکٹر کو بُلایا اور اُس سے پوچھا کہ اس سے پہلے کوئی بچّہ اس حالت میں اُس کے پاس کبھی لایا گیا تھا؟ ڈاکٹر گھوش نے لاپرواہی سے جواب دیا کہ یہ بہت پسماندہ اور جاہل لوگ ہیں۔ ان کے بچّے بہت پیدا ہوتے ہیں۔ بالکل احتیاط نہیں کرتے۔

"اگر یہ پسماندہ اور جاہل ہیں تو کیا تم انہیں انسان نہیں سمجھتے؟" — ڈاکٹر فریزر نے اُس کی لاپرواہی دیکھ کر غصّے سے کہا — "میں نے پوچھا ہے کہ تمہارے پاس اس سے پہلے اس حالت میں کبھی کوئی بچّہ لایا گیا ہے؟ مجھے شک ہے کہ یہ یہاں کی کوئی بیماری ہے جو وبا بنتی جا رہی ہے۔ میرے سوال کا جواب دو۔"

"اس سے پہلے چار بچّے اس حالت میں میرے پاس آ چکے ہیں"۔ ڈاکٹر گھوش نے جواب دیا۔ "لیکن چاروں مر گئے تھے۔"

"کتنے کتنے وقفے کے بعد لائے گئے تھے؟" ڈاکٹر فریزر نے

پوچھا۔ "ان کی موت کس طرح واقع ہوتی تھی؟"

"تقریباً ایک مہینے کے اندر اندر، تین تین چار چار دنوں کے وقفے سے لائے گئے تھے"۔ ڈاکٹر گھوش نے جواب دیا۔ "تین تو ہسپتال میں آتے ہی مر گئے تھے اور چوتھا ایک روز بعد مرا تھا"۔ یہ کہہ کر ڈاکٹر گھوش نے کہا — "محترم ڈاکٹر! اگر آپ نے یہاں ایک ایک مریض پر اتنی زیادہ توجّہ دینی شروع کر دی تو آپ کو بہت تکلیف ہوگی۔ یہ لوگ احتیاط اور پرہیز نہیں کرتے۔ ہماری دوائیاں لے کر بھی اپنے طریقے ہی استعمال کرتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ توہم پرست ہیں غیبی آفتوں میں یقین رکھتے ہیں اور دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے عجیب وغریب حرکتیں کرتے ہیں۔ آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔"

انگریزوں میں یہ خوبی تھی کہ جس بات میں انہیں شک ہوتا تھا اسے وہ لاپرواہی سے چھوڑ نہیں دیتے تھے۔ بال کی کھال اُتار لیتے تھے۔ وہ سب سے زیادہ دلچسپی پسماندہ اور جنگلی لوگوں میں لیتے تھے اور ان کے وہم دُور کر کے انہیں اپنی دوائیوں کا عادی بناتے تھے۔

ڈاکٹر فریزر نے ڈاکٹر گھوش کو ڈانٹ دیا اور کہا کہ ہم تمہیں یہاں عیش کرنے کے لیے تنخواہ نہیں دیتے۔ ہم ان لوگوں کو جنگلی زندگی سے نکال کر اپنی تہذیب میں لانا چاہتے ہیں۔ اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انہیں بیماریوں سے نجات دلائی جائے۔ ڈاکٹر گھوش کو یہ لیکچر دے کر ڈاکٹر فریزر نے مجھے کہا کہ اس عورت سے کہو کہ بچّے کو اندر لائے۔

میں باہر گیا تو وہ عورت جا چکی تھی۔ لہٰذا بچوّں کی اس بیماری کی کوئی تفتیش نہ ہو سکی۔ اس عورت کو ڈھونڈ کر لانا بہت مشکل تھا۔ یہ لوگ بانسوں اور گھاس کی جھونپڑیوں میں چیونٹیوں کی طرح رہتے تھے اور شہر سے تقریباً دو میل دُور تھے۔ علاقہ گھنا جنگل تھا۔ چھوٹی بڑی پہاڑیاں بھی تھیں۔ وہاں بھی یہ مخلوق آباد تھی۔ اُس زمانے میں ان جنگلوں میں درندے بھی ہوتے تھے۔ ڈاکٹر فریزر نے یہ ارادہ کر لیا کہ وہ ان لوگوں میں گھوم پھر کر

انہیں انگریزی طریقۂ علاج سے روشناس کرائے گا اور انہیں توہمات سے نجات دلائے گا۔ ان کے مذہب کے متعلق کچھ بھی پتہ نہ چل سکا کہ کیا ہے۔

وہ ہندو بھی نہیں تھے، مسلمان اور عیسائی بھی نہیں تھے۔ انہیں عبادت کرتے بھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ یہی معلوم ہو سکا کہ ان کے کچھ پیشوا ہوتے ہیں اور انہی کو وہ اپنے دیوتا یا خدا مانتے ہیں۔ بیماریوں کو وہ دیوتاؤں کی ناراضگی اور غصہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اس کا یہ علاج کرتے ہیں کہ جوان لڑکیاں دیوتاؤں کو خوش کرتی ہیں اور لوگ دیوتاؤں کو چاول، ناریل، اناس اور تاڑی کی شراب کی صورت میں تحفے دیتے ہیں۔

ڈاکٹر فریزر نے وہاں کی پولیس سے ان لوگوں کے متعلق جو باتیں معلوم کیں اُن سے یہ پتہ چلا کہ پولیس ان لوگوں میں کوئی دلچسپی نہیں لیتی کیونکہ یہ لوگ کوئی جرم نہیں کرتے۔ چوری، ڈاکہ اور قتل وغیرہ کو یہ خود اتنا بڑا گناہ سمجھتے ہیں کہ ایسے جرائم کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتے۔ انہوں نے اپنے قانون بنا رکھے ہیں جس کی وہ پوری پابندی کرتے ہیں۔ شہر میں، بندرگاہ پر یا کہیں بھی یہ گھومیں پھریں، پولیس کو ان کی طرف سے ایسا کوئی خطرہ نہیں ہوتا کہ کوئی جرم کریں گے۔

ڈاکٹر فریزر نے ان کے متعلق یہ سُنا تو اُس نے اپنا یہ ارادہ اور پکّا کر لیا کہ وہ انہیں نئی تہذیب میں لائے گا۔ اُس نے یہ ارادہ اس امید پر پکّا کیا تھا کہ جو لوگ اخلاق اور قانون کے اتنے زیادہ پابند ہیں وہ شہری تہذیب کو جلدی قبول کر لیں گے۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ ڈاکٹر فریزر انگریزی دوائیوں کے جادُو سے انہیں عیسائی بنانا چاہتا ہے۔ انگریزوں نے افریقہ کے حبشیوں میں ڈاکٹروں کے ہی ذریعے عیسائی مذہب پھیلایا تھا۔

تین دن گزرے تو دو عورتیں گھبرائی ہوئی ہسپتال میں آئیں۔ ایک نے ایک بچّے کو اُٹھا رکھا تھا۔ بچّے کی عمر ایک سال کے لگ بھگ تھی۔ بچّے کی آنکھیں باہر کو آ رہی تھیں۔ منہ کھُلا ہُوا اور زبان باہر نکلی ہُوئی تھی۔ منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ بچّہ سانس لے رہا تھا لیکن بہت مشکل سے۔ ڈاکٹر فریزر نے بچّے کو میز پر لٹایا مگر بچّہ ایک ہچکی لے کر مر گیا۔ ڈاکٹر نے پھر بھی بچّے کا سانس چلانے کی کوشش کی۔ اُس کے سینے سے کپڑا ہٹایا اور سینے کو دبانے لگا۔ اتفاق سے بچّے کی ٹھوڑی اُوپر کو اُٹھ گئی اور سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ بچّے کی شہ رگ پر تقریباً نصف انچ چوڑا اور اس سے ذرا لمبا نشان تھا جیسے وہاں خون جم گیا ہو۔ ڈاکٹر اس نشان کو دیکھتا رہا پھر اس پر جُھک کر بہت غور سے دیکھنے لگا۔ یہ نشان پہلے گلابی رنگ کا تھا۔ دیکھتے دیکھتے اس کا رنگ نیلا ہونے لگا۔

ڈاکٹر فریزر نے ڈاکٹر گھوش کو بُلایا اور اُسے یہ نشان دکھا کر پوچھا کہ اُس نے اس بیماری سے مرنے والے پہلے بچّوں کے گلوں پر ایسا نشان دیکھا تھا؟ ڈاکٹر گھوش نے جواب دیا کہ اُس نے کسی بچّے کی گردن دیکھی ہی نہیں تھی۔

"اگر یہ نشان ہر ایک بچّے کی شہ رگ پر تھا تو میں آپ کو بتا دیتا ہوں کہ یہ بچّے کسی بیماری سے نہیں مرے، انہیں قتل کیا گیا ہے"۔ ڈاکٹر فریزر نے کہا۔ "اگر وہ نہیں تو یہ بچّہ قتل کیا گیا ہے۔ اب میں آپ کو جو کہتا ہوں وہ ان عورتوں سے پوچھو اور یہ جو جواب دیتی ہیں وہ مجھے بتاؤ۔ ان سے پوچھو کہ بچّے کو یہ تکلیف کب اور کس طرح شروع ہوئی؟ کیا ماں یا گھر کا کوئی مرد یا عورت یا بچّہ اس کے پاس تھا؟"

ڈاکٹر گھوش نے اُن کی زبان میں عورتوں سے یہ سوال پُوچھے اور اُن کے جواب سُن کر انگریزی میں ڈاکٹر فریزر کو بتائے۔ جواب یہ تھا کہ ماں کو ایک جگہ سے لکڑیاں اُٹھانے کے لیے گھر سے ذرا باہر جانا تھا۔ یہ اس کا پہلا بچّہ ہے۔ بچّے کا باپ گھر میں نہیں تھا۔ وہ چونکہ لکڑیاں اُٹھانے جا رہی تھی اس لیے بچّے کو ساتھ نہیں لے جا سکتی تھی۔ وہ بچّہ کسی عورت کے حوالے کرنے کے لیے جھونپڑی سے باہر آئی تو ماگین نام کی ایک عورت

اُدھر سے گزر رہی تھی ۔ اُسے کہا کہ وہ ذرا سی دیر بچّے کا خیال رکھے تاکہ وہ لکڑیاں اُٹھا لائے ۔ ماگین نے بچّہ اس کی گود سے لے لیا اور جھونپڑے میں چلی گئی ۔

یہ عورت لکڑیاں لینے چلی گئی لیکن راستے میں ہی اسے خیال آ گیا کہ وہ رسّی ساتھ نہیں لائی ۔ وہ رسّی لینے کے لیے جھونپڑے میں گئی۔ اس نے دیکھا کہ اُس کا بچّہ تیزی تیزی سے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے اور ماگین اُس پر جُھکی ہوئی ہے ۔

ڈاکٹر فریزر نے اس عورت سے پوچھا کہ اور زیادہ سوچ کر بتاؤ کہ ماگین بچّے کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی یا اُس پر صرف جُھکی ہوئی تھی ۔

ڈاکٹر گھوش نے عورت کے جواب کا یہ ترجمہ کیا ۔ "وہ صرف جُھکی ہوئی تھی اور جب ماں اندر داخل ہوئی تو ماگین اپنا ایک ہاتھ بچّے کی گردن سے ہٹا رہی تھی ۔"

"اس سے پوچھو" ڈاکٹر فریزر نے کہا ۔ "اگر ہم کہیں کہ ماگین نے بچّے کو قتل کیا ہے تو کیا یہ مان لے گی ؟"

ڈاکٹر گھوش کی زبانی یہ سوال سُن کر اُس نے اور اُس کے ساتھ آئی ہوئی عورت نے اکٹھے بولنا شروع کر دیا ۔

"نہیں ۔ انہیں ماگین کے خلاف یہ الزام سُن کر غصّہ آ گیا ہے" ۔ ڈاکٹر گھوش نے کہا "یہ کہتی ہیں کہ ماگین بے چاری خود مظلوم عورت ہے ۔ اُس سے دیوتا ناراض ہو گئے ہیں ۔ اس کے دو بچے ہُوئے تھے ۔ دونوں مر گئے ہیں اور خاوند اُسے چھوڑ کر چلا گیا ہے ۔ سارے لوگ اُس کا بہت خیال رکھتے ہیں ۔ وہ ہر عورت کے دُودھ پیتے بچّے سے پیار کرتی ہے ۔ دیوتا ہمارے ساتھ بھی ناراض ہو گئے ہیں ۔ پانچ بچّے اس بیماری سے مر گئے ہیں ۔ ہمارے پروہت دیوتاؤں کو راضی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں"

اب ڈاکٹر گھوش بھی اس واردات میں دلچسپی لینے لگا ۔ وہ کچھ دیر ان عورتوں سے باتیں کرتا رہا پھر اُس نے یہ باتیں ڈاکٹر فریزر کو سنائیں ۔

"یہ لوگ بالکل جنگلی ہیں" ۔ ڈاکٹر گھوش نے کہا ۔ "میں نے انہیں کہا ہے کہ تمہارا یہ بچّہ قتل ہُوا ہے تو یہ مجھے بُرا بھلا کہتی ہیں ۔ انہوں نے بتایا ہے کہ ان کے پیشوا یا بزرگ جنگل میں رہتے ہیں ۔ اُنہوں نے کہا ہے کہ ان پر سارا آسمان ناراض ہو گیا ہے ۔ یہ پیشوا رات کو ان سے قربانیاں اور تحفے لے لیتے ہیں اور آسمان اور سمندر کے دیوتاؤں کو خوش کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں ....

"میں نے ان عورتوں سے پوچھا ہے کہ کیا وہ عورتیں مل سکتی ہیں جن کے بچّے اس بیماری سے مر چکے ہیں ؟ انہوں نے بتایا ہے کہ وہ سب یہیں ہیں ۔ پھر میں نے ان سے یہ پوچھا کہ تم لوگ اگر یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے بچّے دیوتاؤں کی ناراضگی سے مر گئے ہیں تو پھر ہسپتال میں کیوں آتی ہو ؟ اس کا اس نے یہ جواب دیا ہے کہ ہسپتال کی دوائی پر دیوتا کا کوئی اثر نہیں ہوتا"

ڈاکٹر فریزر نے فوراً پولیس کو اطلاع دی اور کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کا ہسپتال اور دوائیوں پر کچھ نہ کچھ اعتماد موجود ہے ۔ اس سے ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں ۔ یہ اپنے پیشواؤں سے بھی عقیدت رکھتے ہیں اور ہم پر بھی بھروسہ کرتے ہیں ۔ میں انہیں اپنے اثر میں لاؤں گا ۔ یہ جنگلی لوگ جنگلوں میں رہتے تھے یا شہروں میں ، یہ سب انگریزوں کی رعایا تھے اور ان پر انگریزی قانون لاگو ہوتا تھا ، اس لیے ڈاکٹر فریزر نے پولیس کو اطلاع دینا ضروری سمجھا ۔

ایک بنگالی تھانیدار آ گیا ۔ ڈاکٹر گھوش نے اُسے بنگالی زبان میں کچھ کہا ۔ اُس نے ڈاکٹر گھوش کو کچھ جواب دیا جو ڈاکٹر گھوش نے ڈاکٹر فریزر کو بتایا ۔ تھانیدار نے کہا تھا ۔ "یہ لوگ ماہی گیری کرتے ہیں لیکن یہ دراصل جنگلوں کے رہنے والے ہیں ۔ ہم نے ان کے معاملات میں کبھی دخل نہیں دیا کیونکہ یہ ہمارے قانون کے خلاف کوئی حرکت نہیں کرتے ۔ بندرگاہ میں آ کر کشتیوں اور دخانی جہازوں سے سامان اُتارتے ہیں ، انہوں نے کبھی چوری نہیں کی ۔ اگر یہ ایک دوسرے کو قتل کرتے

ہیں تو ہمیں کیا؟ کسی شہری کو قتل کریں گے تو ہم انہیں پکڑیں گے۔"

"کیا وہ جنگل جہاں یہ لوگ رہتے ہیں انگریزی قانون کے تحت نہیں؟" ڈاکٹر فریزر نے اُس سے پوچھا۔

"ہیں تو آپ ہی کے قانون کے تحت"۔ تھانیدار نے جواب دیا۔

"پھر میں تمہارے خلاف رپورٹ کیوں نہ لکھوں کہ تم اپنے فرائض میں کوتاہی کر رہے ہو؟" ڈاکٹر فریزر نے کہا۔ "ایک بچہ قتل ہو گیا ہے۔ مجھے شک ہے کہ چار یا پانچ بچے قتل ہوئے ہیں مگر تم نظر انداز کر رہے ہو۔"

تھانیدار بہت گھبرایا۔ اُس نے فوراً اپنا رویّہ بدل لیا اور کہنے لگا کہ حضور جس طرح حکم دیں پُورا کر دوں گا۔ دونوں عورتوں کو وہ ڈاکٹر فریزر کے حکم سے تھانے لے گیا اور بچے کی لاش کو دونوں ڈاکٹر پوسٹ مارٹم کے لیے الگ لے گئے۔ مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ پوسٹ مارٹم میں ڈاکٹروں نے کیا کچھ دیکھا۔ مجھے صرف یہ پتہ چلا کہ بچے کا سانس روک کر اُسے قتل کیا گیا ہے۔ شام کے وقت بچّے کی لاش اُس کی ماں کو دے دی گئی۔

اُس وقت بچے کا باپ دو آدمیوں کے ساتھ ہسپتال میں اپنی بیوی کو ڈھونڈتا ہُوا آ گیا تھا۔ اُس سے معلوم ہُوا کہ اُس کا قبیلہ جنگلوں میں رہتا ہے۔ تھوڑے سے لوگ یہاں شہر میں مزدوری وغیرہ کرنے یا مچھلیاں پکڑنے والوں کے ساتھ اُجرت پر کام کرنے یا خود مچھلیاں پکڑنے کے لیے شہر میں جھگیاں بنا کر رہتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ رات کے وقت وہ جنگل میں جاتے ہیں جہاں ان کے پنڈت قسم کے لوگ کوئی جنتر منتر کرتے اور رسمیں ادا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر گھوش نے انہیں بتایا کہ تمہارے جتنے بچے دم گھٹنے کی بیماری سے مرے ہیں انہیں قتل کیا گیا ہے اس لیے وہ پولیس کی مدد کریں تاکہ قاتل کو پکڑا جائے ورنہ ان کے بہت سے بچے اِسی طرح قتل ہو جائیں گے۔

ڈاکٹر گھوش کو ان لوگوں کی طرف سے یہ جواب ملا کہ وہ اپنے مقدس باپوں سے اجازت لے کر کچھ کریں گے۔ ان سے جب پوچھا گیا کہ کیا وہ ہسپتال میں جب دوائی لینے آتے ہیں تو اپنے مقدّس باپوں سے پوچھ کر آتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ یہاں چوری چُھپے آتے ہیں۔ اُن کے مقدس باپ ان کا یہاں آنا پسند نہیں کرتے۔

اُن کے یہ خیالات معلوم کر کے بھی ڈاکٹر فریزر خوش ہُوا کہ یہ لوگ اگر اپنے جنگلی پیشواؤں یا مقدس باپوں سے آزاد ہو جائیں تو انہیں ہسپتال اور دوائیوں کی طرف مائل کیا جا سکتا ہے۔

دوسرے دن پتہ چلا کہ پولیس اُن ماؤں کو ڈھونڈتے اور انہیں تھانے لے جانے کے لیے ان لوگوں کی جھگیوں میں گئی جن میں سے چار کے بچے مر چکے تھے اور ایک کا بچ گیا تھا۔ ان میں سے وہ عورت کسی نہ کسی خیال سے اپنے بچے کو اُٹھائے ہوئے ہسپتال میں آ گئی جو تین چار دن گزرے اپنے بچّے کو بے ہوشی کی حالت میں لائی تھی۔ یہ بچہ بچ گیا تھا۔ ڈاکٹر فریزر نے بچّے کی گردن کے سامنے جہاں ہنسلی کی دونوں ہڈیاں گردن کے آگے ملتی ہیں ان کے درمیان ہلکا سا ایک نشان تھا جس کا سائز اتنا ہی تھا جتنا مرے ہوئے بچّے کی شہ رگ پر تھا۔

ان لوگوں میں عجیب چیز یہ دیکھی گئی کہ شہروں میں رہنے والے بنگالیوں کے رنگ کالے تھے لیکن جنگلوں میں رہنے والے اِن لوگوں کے رنگ کچھ کچھ گورے تھے یا پیلے اور سُرخ۔ میں یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ بنگال کے ہی باشندے تھے یا نہیں۔ سُنا تھا کہ یہ آسام کے جنگلوں کے رہنے والے ہیں۔ آسامیوں کے رنگ بڑے صاف ہوتے تھے۔ رنگ صاف ہونے کی وجہ سے جسم پر ہلکا سا نشان بھی صاف نظر آ جاتا تھا۔ اس بچّے کی گردن کا نشان بہت ہلکا ہو گیا تھا مگر نظر آتا تھا۔

ڈاکٹر فریزر نے اس عورت سے پوچھا کہ وہ تھانے جانے کی بجائے ہسپتال کیوں آ گئی ہے تو اس نے جواب دیا کہ تھانے میں بدمعاش اور

گنا ہگار لوگ جاتے ہیں۔ اُس نے کہا ۔ "مجھے جب پولیس کے سپاہیوں نے کہا کہ بچے کو لے کر تھانے چلو تو میں نے کہا کہ میں بچے کو لے کر ڈاکٹر کے پاس جاؤں گی جس نے اس کو زندگی دی ہے ۔ میں اپنے بے گناہ بچے کو تھانے میں نہیں لے جاؤں گی۔"

ہم سب اُس کے اِس جواب پر بہت ہنسے ۔ وہ بہت سیدھے سادے لوگ تھے ۔ پولیس نے اُسے کہا کہ اچھا چلو، ہسپتال ہی چلی چلو۔ وہ جب ہسپتال آئی تو تھانیدار بھی آگیا ۔ اس عورت سے پوچھا گیا کہ اس کے بچے کو یہ تکلیف کس طرح شروع ہوئی تھی اور اُس وقت بچہ کس کے پاس تھا ؟

اُس نے بھی ماگین کا نام لیا اور کہا کہ بچہ اُس کے جھونپڑے میں سو رہا تھا۔ اُس کے دوسرے بچے باہر کھیل رہے تھے ۔ وہ جھونپڑے کے باہر مچھلی پکا رہی تھی ۔ ماگین آگئی ۔ "اُس کے آتے ہی بچے کے رونے کی آواز آئی ۔ میں نے ماگین سے کہا کہ بچے کو باہر اٹھا لاؤ ، میں اسے دُودھ پلاؤں ۔ بچہ بہت رو رہا تھا ۔ ماگین اندر گئی تو بچہ چُپ ہوگیا ۔ میں سمجھی کہ ماگین نے اُسے اُٹھا لیا ہے اس لیے چُپ ہوگیا ہے لیکن وہ بچے کو باہر نہیں لائی ۔ تھوڑی دیر گزر گئی تو میں اندر گئی ۔ میں نے خیال کیا کہ ماگین شاید بچے کو سُلانے کی کوشش کر رہی ہے مگر میں اُسے دُودھ پلانا چاہتی تھی ...

"مجھے دیکھ کر ماگین نے کہا کہ دیکھنا بچے کو کیا ہوگیا ہے ۔ میں نے دیکھا ۔ بچے کی آنکھیں باہر آ رہی تھیں ۔ ہاتھ پاؤں بڑی زور سے مار رہا تھا اور اُس کے منہ سے تھوک اور جھاگ نکل رہی تھی ۔"

اس عورت سے بھی پوچھا گیا کہ کیا اسے یہ شک نہیں ہوا کہ ماگین نے اس کے بچے کو قتل کیا ہے ؟ اس نے وہی جواب دیا جو اس سے پہلے ایک عورت دے چکی تھی ۔ وہ بھی ماگین کو مظلوم اور بے گناہ سمجھتی تھی اور کہتی تھی کہ وہ ہمارے بچوں کی دیکھ بھال کرتی رہتی ہے کیونکہ اُس

کے اپنے دو بچے مر گئے ہیں اور خاوند اسے چھوڑ گیا ہے ۔

باقی چار عورتیں بھی پولیس کو مل گئیں ۔ ان میں سے دو نے کہا کہ ہم ابھی آتی ہیں اور وہ غائب ہوگئیں ۔ دو بڑی مشکل سے تھانے چلنے پر رضامند ہوئیں ۔ ڈاکٹر فریزر کو یہ شک تھا کہ بنگالی تھانیدار تفتیش میں گڑبڑ کر کے یہ کہہ دے گا کہ قتل کا کوئی ثبوت نہیں ملا ۔ لہٰذا اُس نے تفتیش پر نگرانی شروع کر دی ۔ وہ ڈاکٹر تھا جس کا پولیس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن انگریز ہونے کی وجہ سے وہ ہر محکمے پر حکم چلا سکتا تھا ۔ چونکہ یہ معاملہ بہت دلچسپ تھا اس لیے میں بھی ڈاکٹر فریزر کے ساتھ چپکا رہا ۔ اُسے مجھ پر اتنا بھروسہ تھا کہ خود بھی مجھے ساتھ ہی رکھتا تھا پھر بھی وہ کہیں اکیلا نکلتا تو میں اُس کے ساتھ چل پڑتا تھا ۔ اس طرح میں نے اس کیس کی ساری تفتیش اپنی آنکھوں دیکھی اور ہم نے اپنے آپ کو جس خطرے میں ڈال دیا وہ الگ قصّہ ہے ۔ وہ بھی اس کے ساتھ ہی سناؤں گا ۔

ان دو عورتوں سے ان کے بچوں کی موت کے متعلق بیان لیے گئے تو انہوں نے بالکل ویسے ہی بیان دیئے جو دو عورتیں پہلے دے چکی تھیں ۔ ان کے بچے ایک ہفتے کے وقفے سے مرے تھے ۔ دونوں کی عمر ایک ایک سال کے لگ بھگ تھی ۔ دونوں بچے بالکل انہی حالات میں قتل ہوئے یعنی مائیں باہر تھیں اور ماگین بچے پر جھکی ہوئی تھی ۔ یہ عورتیں بھی ماگین پر شک کرنے پر آمادہ نہیں تھیں ۔

ان میں سے ایک بچے کو مرے ہوئے چودہ پندرہ دن ہوگئے تھے ۔ یہ بھی اچھا تھا کہ یہ لوگ لاشوں کو دفن کرتے تھے ۔ ڈاکٹر فریزر نے اس بچے کی قبر کے متعلق پوچھا تو پتہ چلا کہ ان کا قبرستان جنگل میں ہے ۔ اس بچے کے ماں باپ ڈاکٹر فریزر کو اپنے ساتھ قبرستان تک لے گئے ۔ تھانیدار اور چار سپاہی ساتھ تھے ۔ میں بھی ساتھ تھا ۔ قبر کھودنے کے لیے دو آدمی بھی ساتھ تھے ۔ قبر کھود کر لاش نکالی گئی ۔ اُس وقت بچے کی ماں اور اُس کا باپ ہم سب پر ٹوٹ ٹوٹ پڑتے تھے ۔ انہیں سمجھانے کی بہت

کوشش کی گئی کہ قاتل کا سراغ لگانے کے لیے لاش کو دیکھنا ضروری ہے
جسے بعد میں پھر دفن کر دیں گے لیکن وہ کچھ بھی نہیں سمجھ رہے تھے۔ ان
کے ساتھ زبردستی کرنی پڑی۔ لاش سُوج گئی تھی۔
میں حیران تھا کہ اس خراب حالت میں ڈاکٹر لاش میں کیا دیکھیں
گے۔ بچّے کے ماں باپ بہت تیز دوڑتے ہوئے جنگل میں غائب ہو
گئے اور ہم لاش ہسپتال میں لے آئے۔ مجھے معلوم نہیں کہ لاش کے ساتھ
ڈاکٹر فرزر نے کیا کیا۔ وہ تین گھنٹے اندر رہا۔ اُس نے پھر لاش پولیس کے
حوالے کر کے کہا کہ اُسی قبر میں دفن کر آؤ۔ شام کے وقت میں نے اُس سے
پوچھا تو اُس نے بتایا کہ اس بچے کو بھی سانس روک کر مارا گیا ہے۔
تھانیدار نے ایک سپاہی اور وہ دو آدمی جنہوں نے قبر کھودی تھی،

لاش کو دفن کرنے کے لیے بھیج دئیے اور ماگین کی تلاش شروع ہو گئی۔
شام کے وقت پولیس کا سپاہی سخت زخمی حالت میں ہسپتال میں لایا
گیا۔ تھانیدار ڈاکٹر فریزر کے پاس آیا۔ ڈاکٹر گھوش بھی اُس کے ساتھ
تھا۔ تھانیدار انگریزی نہیں جانتا تھا۔ ڈاکٹر گھوش نے ڈاکٹر فریزر کو بتایا
کہ اُس نے ان جنگلیوں کے معاملات میں دخل دے کر سخت غلطی کی ہے۔
تھانیدار نے بتایا کہ جب پولیس کا سپاہی دو آدمیوں کے ساتھ
بچّے کی لاش قبر میں رکھنے کے لیے گیا تو انہوں نے دُور سے دیکھا کہ قبرستان
میں پانچ چھ جنگلی آدمی کھڑے ہیں۔ وہ سپاہی اور ان دو آدمیوں کو دیکھ
کر بھاگ گئے۔ جب یہ تینوں لاش قبر میں رکھ رہے تھے تو اچانک
پانچ چھ آدمی اُن پر ٹوٹ پڑے۔ اُن کے پاس بانسوں کی لاٹھیاں تھیں
جن کے سرے برچھیوں کی طرح تھے۔ سپاہی کے پاس لاٹھی تھی اور بیلچہ
بھی ہاتھ تھا۔ سپاہی کو بانسوں کی تین چار برچھیاں لگیں۔ اُس نے فوراً
بیلچہ اٹھا لیا۔ اس سے اُس نے برچھیوں کے وار روکے اور وار کیے لیکن
وہ جلدی بھاگ آیا۔ اُسے کچھ خبر نہیں تھی کہ جو دو آدمی اُس کے ساتھ تھے،
وہ مارے گئے ہیں یا زندہ ہیں۔

سپاہی کو میں نے دیکھا۔ اُس کی پیٹھ میں اور ایک ران میں نوکدار بانس
لگے تھے۔ وہ خوش قسمت تھا کہ بچ گیا۔ اُس کے زخموں پر پٹیاں باندھی
گئیں اور فوراً پولیس کی پوری گارد رائفلوں سے مسلّح بھیجی گئی۔ وہ علاقہ خطرناک
تھا۔ پہاڑیاں اور جنگل تھا۔ آدمی ذرا اِدھر اُدھر ہو جائے تو مل نہیں سکتا تھا۔

گارد سورج غروب ہونے سے پہلے پہنچ گئی تھی۔ وہاں دونوں آدمی نہیں
تھے۔ خون بہت تھا۔ خون ایک طرف کو گرتا گیا۔ گارد خون کو دیکھتی ہوئی
آگے گئی مگر اندھیرا ہو جانے کی وجہ سے گارد واپس آ گئی۔ صبح سورج نکلنے
سے بہت پہلے گارد پھر بھیجی گئی۔ تقریباً چار گھنٹے بعد گارد ہسپتال میں دو لاشیں
لائی۔ دونوں کے سر گردنوں سے کٹے ہوئے تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ لاشیں
قبرستان میں پڑی ملی تھیں۔ دونوں کے جسم برچھیوں سے چھلنی تھے اور یہ وہی
دو آدمی تھے جنہوں نے بچّے کی لاش نکالی اور دفن کی تھی۔ ان جنگلیوں نے
ان کی کھوپڑیاں کاٹ لی تھیں۔
ڈاکٹر فریزر نے پولیس ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دی تو ایک انگریز پولیس انسپکٹر
شام کے وقت آ گیا۔ اُس نے بتایا کہ یہ لوگ آسام کے خطرناک قبائلی ہیں۔ اُن
کے رسم و رواج افریقہ کے حبشیوں سے ملتے جلتے ہیں۔ یہ لوگ انسانی
کھوپڑیوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔ ان کے بچّے کی لاش قبر سے نکالنا
سخت غلطی تھی۔ انہوں نے ان دو آدمیوں کی کھوپڑیاں اُتار کر صرف
انتقام نہیں لیا بلکہ وہ یہ کھوپڑیاں اپنے دیوتاؤں کو پیش کریں گے اور ہو سکتا
ہے کہ وہ آج رات جشن منا رہے ہوں۔
یہ انگریز انسپکٹر بہت دلیر اور زندہ دل معلوم ہوتا تھا۔ اُس کا نام
ایچیسن تھا۔ اُس نے ڈاکٹر فریزر سے کہا کہ اگر وہ ہمت کرے تو رات
کو تماشہ دکھایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر فریزر بھی انسپکٹر ایچیسن کی طرح جوان
اور دلیر آدمی تھا۔ وہ تیار ہو گیا۔ دونوں نے ریوالور لے لیے۔ میرا ساتھ
جانا ضروری تھا۔ پولیس سے ایک رائفل منگوائی گئی۔ ٹارچ بھی میرے
ہاتھ میں دے دی گئی۔ انسپکٹر ایچیسن نے کہا تھا کہ ریوالور پاس ہوں

تو یہ لوگ سینکڑوں کی تعداد میں بھی آجائیں تو کوئی خطرہ نہیں صرف ایک گولی سب کو بھگا دے گی، لیکن پروگرام یہ نہیں تھا کہ ان لوگوں کو پکڑنا ہے بلکہ ارادہ یہ تھا کہ دُور سے تماشہ دیکھنا ہے۔

شام کے کھانے کے بعد ہم چل پڑے۔ انسپکٹر اچیسن نے بنگالی تھانیدار سے کہہ کر ایک آدمی بُلا لیا تھا جو رہبری کے لیے ساتھ تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ یہ جنگلی کہاں رہتے ہیں۔ شہر سے نکل کر ہم ایسے علاقے میں داخل ہو گئے جہاں پہاڑیاں، پانی، جنگل اور اونچی گھاس تھی۔ چلنا بہت مشکل تھا۔ تھوڑے سے فاصلے پر جاتے تھے تو ہمارا گائیڈ کسی نہ کسی طرف مُڑ جاتا تھا۔

رات اندھیری تھی۔ گائیڈ ہوشیار تھا۔ اس کے بغیر ہم بھٹکتے پھرتے۔ ایک جگہ گائیڈ رُک گیا۔ اُس نے بتایا کہ تھوڑی دُور آگے ندی ہے جو پانی میں سے گزر کر پار کرنی پڑے گی۔ پانی گہرا نہیں ہو گا۔ تھوڑی دیر بعد ہم ندی میں سے گزر رہے تھے۔ پانی گھٹنوں سے ذرا اُوپر تھا۔ ندی پار کر کے ہم ایک پہاڑی کے ساتھ چلنے لگے اور دُور سے ڈھول کی دھم دھم سُنائی دینے لگی۔ اندھیری رات اور ایسے گھنے جنگل میں یہ دھم دھم ایسے سُنائی دیتی تھی جیسے انسان نہیں بلکہ جنّ بھوت بجا رہے ہوں میں پنجاب کے ڈھولوں کی آواز جانتا تھا۔ ایسی آواز جو جنگل میں سُنائی دے رہی تھی میرے لیے بڑی ہی عجیب تھی۔ ہم اس آواز کی طرف جا رہے تھے۔ پھر ہمیں انسانوں کے نعروں کی طرح کا شور سُنائی دینے لگا۔

میرا خیال ہے ہمیں چلتے چار گھنٹے گزر گئے تھے۔ آوازیں اتنی اونچی ہو گئیں جیسے دس پندرہ قدم دُور سے آ رہی ہوں۔ آگے ایک ٹیکری تھی۔ شور شرابا اور ڈھول کی دھم دھم اس ٹیکری کے دوسری طرف تھی۔ گائیڈ ٹیکری پر چڑھنے لگا۔ ہم بھی چڑھنے لگے۔ اس پر درخت بہت تھے۔ ہم ذرا اُوپر گئے تو آسمان روشن ہو گیا اور لوگوں کا شور بند ہو گیا۔ اب صرف ڈھول کی دھم دھم اور اس کی تال پر تالی کی آوازیں آنے لگیں اور ان کے

ساتھ باریک باریک گھنٹیوں کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ یہ تال اور موسیقی کسی اور ہی دُنیا کی تھی۔

گائیڈ اُوپر جا کر بیٹھ گیا۔ ہم ذرا نیچے تھے۔ گائیڈ پر ہلکی ہلکی روشنی پڑ رہی تھی۔ ڈاکٹر فرزیر اور انسپکٹر اچیسن بھی اوپر جا کر بیٹھ گئے۔ میں جب اُن کے قریب پہنچا تو سامنے وہی منظر دیکھا جس کے متعلق لوگ بتایا کرتے تھے۔ پنجاب کے دیہات میں مشہور تھا کہ رات کے وقت جنگل میں جنّ اور چڑیلیں انسانوں کا رُوپ دھار کر ناچ گانا کیا کرتی ہیں۔ کوئی انہیں دیکھتا تو انہیں انسان سمجھ کر ان کے پاس چلا جاتا پھر واپس نہیں آ سکتا تھا۔

میں نے بالکل وہی منظر دیکھا۔ جنّ اور چڑیلیں انسانوں کے رُوپ میں ناچ رہی تھیں۔ بہت سی مشعلیں جو انہوں نے بانسوں کے ساتھ کوئی خاص لکڑی باندھ کر بنائی تھیں، جل رہی تھیں۔ دو جگہ لکڑیوں کے الاؤ تھے۔ وہ لوگ ہم سے زیادہ دُور نہیں تھے۔ ہم ٹیکری کے اُوپر تھے اور وہ نیچے۔ جہاں وہ تھے وہاں میدان تھا۔ بہت سے جنگلی دائرے میں بیٹھے تھے۔ درمیان میں تیرہ لڑکیاں ناچ رہی تھیں۔ سر سے ناف تک وہ ننگی تھیں۔ کمر کے گرد ٹخنوں تک تھوڑا سا کپڑا باندھ رکھا تھا۔ سب کے بال کُھلے تھے۔ اُن کی حرکات بالکل ایک جیسی اور اکٹھی تھیں۔ کسی لڑکی کا سر بھی نہیں ہلتا تھا۔ اگر سر ہلتا تھا تو ایک نہیں بلکہ تیرہ سر ایک ہی حرکت کرتے تھے۔ وہ بڑی آہستہ آہستہ جسم کو حرکت دیتی تھیں اور جسم کو ایسے انداز سے بل دیتی تھیں کہ دل پر عجیب سا اثر ہوتا تھا۔ ان کا جس طرف مُنہ تھا اُدھر پانچ آدمی زمین پر شاہانہ انداز سے بیٹھے تھے۔ وہ بھی سر سے ناف تک ننگے تھے۔

یہ ناچ جاری تھا کہ ایک طرف سے آدمیوں کی ایک قطار نکلی اور نہایت خوبصورتی سے لڑکیوں کی قطار میں شامل ہو گئی۔ ان آدمیوں کے جسم آگ کی روشنی میں بہت ہی خوبصورت لگتے تھے۔ وہ بھی ناف

تک ننگے تھے۔ لڑکیوں کے ساتھ مل کر ان آدمیوں نے جب ناچ شروع کیا تو عجیب ہی سماں بندھ گیا۔ یہ ناچ اُچھل کُود والا نہیں تھا۔ ایسے نظر آتا تھا جیسے پانی میں مچھلیاں بڑے آرام آرام سے تیر رہی ہوں۔ اس کے ساتھ ڈھول کی ہلکی ہلکی دھم دھم اور گھنٹیوں کی آوازیں دل کشی میں اضافہ کر رہی تھیں۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ دونوں انگریز دم بخود ہو گئے تھے۔ میری حالت یہ تھی کہ میں ان ناچنے والوں کو انسان نہیں جن ماننے لگا تھا مگر یہ جادو فوراً ہی ٹوٹ گیا کیونکہ یہ لوگ اچانک ہی جنگلی بن گئے۔ ڈھولوں کی تھاپ بھی بدل گئی۔ ناچنے والے بیہودہ طریقے سے کُودنے لگے۔ کُودتے اچھلتے یہ لڑکیاں اور آدمی ایک طرف چلے گئے اور میدان خالی ہو گیا۔

یکلخت سارا ہجوم خوشی سے چیخنے اور چلّانے لگا۔ ایک طرف سے پانچ آدمی سامنے آئے۔ ہر ایک نے بازوؤں پر ایک ایک جوان لڑکی اُٹھا رکھی تھی۔ وہ ایک صف میں ڈھول کی دھم دھم پر آگے بڑھنے لگے اور اُن پانچ آدمیوں کے آگے ایک ایک لڑکی زمین پر لٹا دی جو بادشاہوں کی طرح بیٹھے تھے۔ یہی اُن کے مقدّس باپ تھے۔ وہ اُٹھے اور اس کے ساتھ ہی جنگلیوں پر سنّاٹا طاری ہو گیا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے یہ سب مٹی کے بُت ہیں۔ پانچوں لڑکیاں زمین پر چت لیٹی رہیں۔ ان کے مقدّس باپوں نے معلوم نہیں کیا کہا۔ وہ تھوڑی دیر بولتے رہے پھر لوگ وہاں سے جانے لگے۔

مشعلیں بھی چلی گئیں۔ دو جگہوں پر آگ جل رہی تھی جس کی روشنی میں پانچ آدمی اور ان کے سامنے لیٹی ہوئی پانچ لڑکیاں نظر آتی رہیں۔ وہ لڑکیوں کے قریب گئے اور لڑکیاں اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ یہ آدمی مختلف سمتوں کو چل پڑے۔ ہر ایک کے پیچھے ایک ایک لڑکی جا رہی تھی۔ انسپکٹر اٹچیسن نے ڈاکٹر فریزر کو بتایا کہ یہ لڑکیاں انہیں قربانی کے طور پر دی گئی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ قربانی دیوتاؤں کو دی جا رہی ہے۔ یہ

پانچ آدمی مقدّس باپ کہلاتے ہیں۔ شراب میں بدمست ہیں۔ یہ اب کئی دن ان لڑکیوں کو اپنے پاس رکھیں گے۔

ڈاکٹر فریزر نے پریشان سا ہو کر کہا — "میں ان لوگوں کو اس پسماندگی اور اس فریب سے نکالنا چاہتا ہوں۔"

اٹچیسن نے اُسے کہا — "اگر انہیں پتہ چل جائے کہ ہم یہاں انہیں دیکھ رہے ہیں تو یہ سارا ہجوم ہمیں گھیر کر پتھروں اور بانسوں کی برچھیوں سے ختم کر دے۔ پھر ہماری کھوپڑیاں بھی ان کے کھوپڑیوں کے خزانے میں جمع ہو جائیں گی۔ انہیں شہری تہذیب میں لانے کے لیے ایک صدی لگے گی.... آؤ چلیں۔"

"تمہارے جو دو آدمی قتل ہو گئے ہیں، ان کے متعلق کوئی کارروائی نہیں کرو گے؟" — ڈاکٹر فریزر نے پوچھا۔

"نہیں" — انسپکٹر نے جواب دیا — "ان کے قاتلوں کو پکڑنے کے لیے ہمیں پوری پولیس فورس اور فوج سے اس سارے جنگل پر حملہ کرنا پڑے گا جس کے نتیجے میں کچھ ہمارے آدمی مارے جائیں گے اور بہت سے ان کے۔ ہم ایسی کارروائی نہیں کریں گے۔ ہم اتنا ہی کریں گے کہ ان دو آدمیوں کے گھر والوں کو کچھ رقم دے دیں گے کیونکہ وہ پولیس کا کام کرتے ہوئے مارے گئے ہیں۔"

ہم واپس چل پڑے۔ جب اپنے ٹھکانے پر پہنچے تو رات ختم ہو چکی تھی اور ہندو تھانیدار انتظار میں بیٹھا تھا۔ اُس نے یہ خبر سنائی کہ ماگین کو پکڑ لیا گیا ہے اور چند ایک گواہ بھی مل گئے ہیں۔ اس ہندو نے یہ پھُرتی صرف اس لیے دکھائی تھی کہ اُس کے محکمے کا انگریز انسپکٹر آ گیا تھا ورنہ وہ بچوں کے قتل میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ اُس نے مزدوروں میں کام کرنے والے سرکاری مخبروں کے ذریعے ماگین کا سراغ لگا لیا تھا۔ وہ اکیلی رہتی تھی۔ اُسے تھانے لے گئے اور تین ایسے آدمی بھی ہاتھ آ گئے جو ماگین کے قبیلے کے تھے اور اُسے پوری طرح جانتے تھے۔ انسپکٹر اٹچیسن

نے تھانیدار سے کہا کہ ان سب کو وہیں (ڈاکٹر فریزر کے بنگلے میں) لے آئے۔ وہ دوڑتا گیا اور ان لوگوں کو لے آیا۔

ماگین جوان عورت تھی۔ وہ کوئی ایسی خوبصورت تو نہیں تھی لیکن بدصورت بھی نہیں تھی۔ اُس کے ساتھ تین آدمی تھے۔ ان کے ساتھ باتیں کرنے اور ان کی باتیں سمجھانے کا کام ڈاکٹر گھوش نے کیا۔ سب سے پہلے ماگین سے پوچھا گیا کہ کیا اُس نے ان بچوں کو قتل کیا ہے؟

اُس کے چہرے پر کوئی تبدیلی نہ آئی۔ اُس نے اپنے ساتھ آئے ہوئے آدمیوں کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اُسے اپنی زبان میں کچھ کہا تو وہ ڈاکٹر فریزر اور انسپکٹر اپچیسن کی طرف دیکھنے لگی جیسے اُس نے بات سُنی یا سمجھی ہی نہ ہو۔ کئی بار پوچھنے کے باوجود وہ بالکل خاموش رہی۔

انگریز انسپکٹر نے ڈاکٹر فریزر سے کہا "اس عورت کے دماغ پر کوئی شدید اثر ہے۔ اس نے بچوں کو قتل ضرور کیا ہے لیکن ہوش میں نہیں۔ کیا یہ کسی پاگل پن کی حالت میں قتل کرتی ہے؟ اس کے متعلق کچھ پوچھنا پڑے گا۔"

اُس نے ماگین کو باہر بھیج دیا اور اُس کے ساتھ آئے ہوئے آدمیوں سے اُس کے متعلق کچھ پوچھا۔ وہ اُسے اچھی طرح جانتے تھے۔

انہوں نے بتایا کہ ماگین کی شادی ایک ایسے آدمی کے ساتھ ہو گئی تھی جو بہت بُرا آدمی تھا۔ اُس کی توجہ دوسری عورتوں کی طرف رہتی تھی۔ شراب پیتا تھا اور غائب رہتا تھا۔ اس کے دو بچے پیدا ہوئے۔ ایک کی عمر چار سال ہوئی اور دوسرے کی ایک سال تو ایک روز اس کا خاوند ایک عورت کے ساتھ پکڑا گیا۔ ان لوگوں میں شادی شدہ مرد یا عورت کا کسی دوسرے سے تعلقات رکھنا اتنا ذلیل جرم سمجھا جاتا تھا کہ دونوں کو قتل کر کے ان کے سر جسموں سے کاٹ دیئے جاتے تھے۔ جسم ایسے پانی میں جا کر پھینکے جاتے تھے جس میں مگرمچھ ہوتے تھے اور سر جنگل میں پھینک دیئے جاتے تھے۔ شادی شدہ عورت صرف

مقدس باپ کے پاس جا سکتی تھی بشرطیکہ وہ اس عورت کو اپنے پاس بلائے۔ اس صورت میں ایسی عورت کا خاوند فخر کیا کرتا تھا لیکن یہ اعزاز کسی بہت ہی خوبصورت شادی شدہ عورت کو حاصل ہوتا تھا۔ ماگین کا خاوند ایک عورت کے ساتھ پکڑا گیا۔ پکڑنے والے دو آدمی تھے۔ ماگین کا خاوند ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کے بعد وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ عورت کو قبیلے نے سزائے موت دے دی۔ اس کا جسم اور سر غائب کر دیئے گئے۔ ماگین اسی طرح خاموش رہنے لگی جس طرح اب ہے۔

دس بارہ دنوں بعد اس کا چھوٹا بچہ مر گیا۔ ان تین آدمیوں میں سے ایک نے اس کے بچے کو دیکھا تھا۔ اُس کی آنکھیں بہت زیادہ کُھلی ہوئی تھیں اور زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ منہ سے جھاگ نکلی ہوئی تھی اور چہرے کا رنگ نیلا ہو گیا تھا۔ مقدس باپ نے بچے کی لاش دیکھ کر بتایا کہ اس عورت پر دیوتا سخت ناراض ہے۔ بچے کو دفن کر دیا گیا اور رات کو دو کنواری لڑکیوں کی قربانی دی گئی۔

پندرہ سولہ روز بعد ماگین کا بڑا بچہ بھی بالکل اسی حالت میں مر گیا۔ یہ تین مہینے پہلے کا واقعہ ہے۔ اس بچے کے مرنے کے کچھ دن بعد ایک اور ماں کا بچہ جس کی عمر ایک سال تھی اسی حالت میں مر گیا۔ اُس وقت بچے کی ماں باہر تھی اور ماگین بچے کے پاس تھی۔ یہ بچہ جنگل میں مرا تھا۔ سارا قبیلہ بہت ڈرا۔ مقدس باپ نے کہا کہ یہ عورت یہاں سے چلی جائے۔ دیوتا اس سے ناراض ہیں۔ اس دوران یہ تین آدمی محنت مزدوری کے لیے چٹا گانگ میں آ گئے۔ یہاں جنگلی اکثر آتے رہتے ہیں جن میں سے بہت سے شہر کے قریب جھگیاں بنا کر آباد ہو گئے تھے۔ ماگین ان کے ساتھ آ گئی۔

اس کے قبیلے کی عورتیں اسے مظلوم عورت سمجھ کر اس کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ وہ کوئی کام نہیں کرتی تھی۔ اسے یہ لوگ گھر کے فرد کی طرح کھانا دیتے تھے۔ یہاں آ کر بھی بچے اسی بیماری سے مرنے لگے پھر بھی کسی

کو شک نہ ہُوا کہ بچّوں کو ماگین قتل کرتی ہے۔ ان لوگوں نے جنگل میں جا کر مقدّس باپوں کو بتایا۔ انہوں نے کچھ اپنی رسمیں ادا کیں۔ پھر جب ایک بچّے کی لاش قبر کھود کر نکالی گئی تو جنگلیوں کو پتہ چل گیا۔ سارے قبیلے پر دہشت طاری ہوگئی۔ وہ خوفزدہ ہو گئے کہ اب ان پر بڑا ہی ظالم قہر نازل ہوگا۔ اس سے بچنے کا یہی ذریعہ تھا کہ قبر کھودنے والوں کی کھوپڑیاں اُتار کر دیوتاؤں کو پیش کی جائیں۔ قبیلے کے بڑوں نے اپنا کوئی حساب کر کے بتایا کہ پانچ کنواریوں کی قربانی دینی ہوگی۔ یہ قربانی رات کو دے دی گئی۔ یہ تین آدمی اور ماگین اس قربانی میں شریک نہیں ہو سکے کیونکہ پولیس نے انہیں پکڑ لیا تھا۔ بہرحال ہم قربانی کی یہ رسم دیکھ آئے تھے۔

ماگین کے متعلق دونوں انگریزوں کی رائے یہ تھی کہ اس کا دماغ اس کے قابو سے نکل گیا ہے۔ اس نے اسی پاگل پن میں اپنے بچوں کو قتل کر کے خاوند سے انتقام لیا ہے۔ شاید اس سے اسے کچھ سکون ملتا ہوگا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک سال کی عمر کے بچّے کو دیکھ کر وہ بھڑک اٹھتی ہو اور اُسے انتقام کے طور پر مار دیتی ہو۔ ماگین سے ایک بار پھر انسپکٹر اچیسن اور ڈاکٹر فریزر نے باتیں کیں لیکن اُس پر خاموشی طاری رہی۔ اپنے آدمیوں کے کہنے کے باوجود اُس نے زبان نہ کھولی۔ اس کے کانوں میں بار بار یہ بات ڈالی گئی ”تم نے اپنے اور دوسروں کے بچّوں کو قتل کیا ہے“۔ مگر وہ بُت بن کر بیٹھی رہی۔

دونوں انگریزوں نے اس کے ساتھ کے تین آدمیوں کو بتایا کہ تمہارے بچّوں کو یہ عورت قتل کرتی ہے۔ اگر اسے چھوڑ دیا گیا تو بچّوں کو قتل کرتی رہے گی، اس لیے ہم اسے جانے نہیں دیں گے۔ اسے کسی پاگل خانے میں بھیج دیں گے۔ یہ لوگ کچھ بھی نہیں سمجھ رہے تھے۔ انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ پاگل خانہ کیا ہوتا ہے۔

ماگین کو پھر بٹھا دیا گیا۔ مجھے ڈاکٹر فریزر نے کسی کام کے لیے ہسپتال بھیج دیا۔ میں دو گھنٹے بعد بنگلے میں گیا تو پتہ چلا کہ ماگین لاپتہ ہے۔ کسی کو

پتہ نہ چل سکا کہ وہ کس وقت اور کس طرف نکل گئی ہے۔ جھونپڑوں میں بھی نہیں گئی۔ سورج غروب ہونے سے پہلے اُس کی لاش ہسپتال میں لائی گئی۔ یہ جھونپڑوں سے ایک میل دُور جنگل سے اٹھائی گئی تھی۔ ماگین کی لاش کی گردن کے گرد ایک کپڑا کس کر بندھا ہُوا تھا۔ گانٹھ پیچھے تھی۔ اُس نے بڑی عقلمندی سے اپنے آپ کو قتل کیا تھا۔ اس کپڑے میں چھوٹا سا ایک پتھر بندھا ہُوا تھا جو اس کی شہ رگ پر بالکل اُس مقام پر تھا جہاں وہ انگوٹھا رکھ کر بچّوں کا سانس روکتی تھی۔ اُس نے پتھر کپڑے میں باندھ کر شہ رگ کے اس مقام پر رکھا اور کپڑے کو اپنی گردن کے پیچھے گانٹھ دے دی۔ پتھر نے شہ رگ کو دبا کر اس کا سانس روک دیا اور اسے اُسی طرح ہلاک کیا جس طرح اُس نے دو اپنے اور پانچ دوسروں کے بچّوں کو قتل کیا تھا۔



پندرہ برس بعد

رچرڈ انگلینڈ سے پندرہ برس بعد برما آیا تھا۔ برما کا چھوٹا سا گاؤں تھانگ دُو بالکل بدل گیا تھا۔ رچرڈ کو قطعاً توقع نہیں تھی کہ برما کے جن دیہات کو جنگِ عظیم نے تباہ و برباد کر دیا تھا وہ کبھی اپنی اصلی شکل میں آ بھی سکیں گے۔ اُسے سب سے زیادہ دلچسپی برما کے اس چھوٹے سے گاؤں تھانگ دُو سے تھی۔ پندرہ برس گزرے وہ اس علاقے میں جاپانیوں کے خلاف لڑا تھا اور اُس نے اس گاؤں کو نذرِ آتش کروا دیا تھا۔ وہ اُس وقت فوج میں میجر تھا۔

جاپان کو شکست ہوئی۔ جاپانی فوجیں برما سے بھاگ گئیں۔ برما پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہو گیا اور جنگ ختم ہو گئی۔ میجر رچرڈ فوج سے پنشن لے کر نکل آیا اور انگلینڈ کی ایک پرائیویٹ فرم میں نہایت اچھی ملازمت کر لی۔ وہ زندگی میں ہر لحاظ سے مطمئن تھا۔ جنگ میں وہ فاتح رہا اور امن میں اُسے قابلِ رشک حیثیت حاصل ہو گئی۔ اُس نے سوچا تھا کہ وہ جنگ کی صعوبتوں، تلخیوں اور خون خرابے کو شہری زندگی کی گہما گہمی میں فراموش کر کے پُرامن زندگی بسر کرے گا مگر برما کا یہ چھوٹا سا گاؤں جو اُسے تھانگ دُو کے نام سے اچھی طرح یاد تھا اُس کے اعصاب پر آسیب کی طرح سوار رہا اور یہ گاؤں ایک گناہ بن کر اُس کے ضمیر کو دبوچے ہی رہا۔

پندرہ برس گزر گئے۔

آخر وہ گناہ کا کفّارہ ادا کرنے کے لیے دولت کا انبار لے کر برما پہنچ گیا۔ برما میں اب جنگ کی تباہ کاریوں اور ہولناکی کے کوئی آثار نظر نہ آتے تھے۔ برما کے کسانوں نے اپنے ملک کی کایا پلٹ ڈالی تھی۔

رچرڈ طویل مسافت طے کر کے تھانگ دُو پہنچا تھا۔ اُس نے شمالی برما کے اس گاؤں کے راستے میں وہ تمام گاؤں دیکھے جہاں جہاں وہ لڑا تھا۔ اُس وقت

یہاں کوئی جھونپڑا زمین پر ایستادہ نظر نہ آتا تھا۔ دھان کی کھیتیاں جل گئی تھیں، تاڑ کے پیڑ جھلس گئے تھے، پانی سے لبریز کھیتوں کو توپوں کے گولوں اور طیاروں کے بموں نے خشک کر ڈالا تھا اور ہر سو لاشیں ہی لاشیں گل سڑ رہی تھیں۔

اور آج، پندرہ برس بعد، کھیتیاں اور پیڑ پھر ہرے بھرے اور جھونپڑے پھر کھڑے ہو گئے تھے۔ ایک نسل کو جنگ نے ختم کر ڈالا تھا اور اب دوسری نسل نے بستیوں کو پھر آباد کر لیا تھا۔ تھانگ دُو، جو اس کے اعصاب کا آسیب اور ضمیر کا زہریلا کانٹا بن گیا تھا، پھر سے جی اُٹھا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ کسان کھیتوں میں کام کاج میں مصروف تھے۔ نمناک مینڈھوں پر بچے کھیل رہے تھے۔ عورتیں لُنگیوں میں ملبوس گردو پیش سے بے خبر دھان کی پنیری کو گھٹنے گھٹنے پانی میں جما رہی تھیں۔ کیا مرد اور کیا عورتیں، سبھی دُہرے ہو کر دھرتی سے لَو لگائے ہُوئے تھے۔ کسی نے بھی رچرڈ کی طرف آنکھ اُٹھا کے نہ دیکھا۔ وہ اپنے آپ کو سفید چمڑی کی وجہ سے برما کے کسانوں سے برتر انسان سمجھتا تھا۔ اُسے توقع تھی کہ اس پسماندہ ملک کے لوگ اُسے غلاموں کی طرح دیکھیں گے مگر کسی نے اُس کی طرف بھولے سے بھی دھیان نہ دیا۔

وہ ایک جگہ رُک گیا اور تھانگ دُو کے جھونپڑوں کو دیکھنے لگا۔ تمام جھونپڑے ایک جیسے تھے ــــ بانسوں کے ستونوں پر ایستادہ بانسوں کے چبوترے پر گھاس پھونس اور سرکنڈوں کے بنے ہوئے جھونپڑے۔ ہر چبوترے کے ساتھ بانسوں کی سیڑھی لگی ہُوئی تھی ــــ رچرڈ کو خوب یاد تھا کہ جنگ میں ان میں سے کئی جھونپڑے جل گئے تھے۔

وہ خیالوں میں گم ہو چلا تھا کہ اُسے اپنے قریب آواز سنائی دی ــــ ”میرا نام مانگ پے ہے۔ میں تھانگ دُو کا نمبردار ہوں۔ خوش آمدید۔“

رچرڈ نے چونک کر نمبردار کو دیکھا اور چند لمحے اُسے دیکھتا ہی رہا ــــ ”تھانگ دُو کا نمبردار“ ــــ یہ الفاظ اُسے زہریلے تیروں کی طرح لگے۔

”میرا نام رچرڈ ہے“ ــــ اُس نے بوکھلائے ہوتے سے لہجے میں نمبردار سے کہا ــــ ”خدا تمہیں خوش و خرم رکھے“ ــــ اُس نے ہاتھ آگے کیا اور برمی نمبردار

سے پُوچھا ــــ ”کیا تمہیں معلوم تھا کہ میں آ رہا ہوں؟“

مانگ پے نے کوئی جواب نہ دیا نہ اُس نے رچرڈ سے ہاتھ ملایا، بلکہ وہ دونوں ہاتھوں کی اُنگلیوں کو جوڑے ہوئے گیلی زمین کو دیکھنے لگا۔

رچرڈ کو برمی نمبردار کا یہ رویّہ اچھا نہ لگا لیکن وہ تھانگ دُو کے لوگوں کے لیے خیر سگالی کے جذبات لے کے آیا تھا۔ وہ یہاں کے ہر فرد کو دوست بنانا چاہتا تھا ــــ ”میں تمہارا مشکور ہوں کہ تم مجھے ملنے چلے آئے“ ــــ اُس نے مُسکرا کر کہا ــــ ”تمہیں شاید معلوم ہو گا کہ میں یہاں چند دن قیام کروں گا۔“

”مجھے معلوم ہے“ ــــ مانگ پے نے کہا ــــ ”سرکار سے مجھے حکم مل گیا تھا کہ آپ آ رہے ہیں۔ آپ کی رہائش اور خوراک کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ مہمان خانہ تیار ہے۔“

نمبردار کے لہجے میں خلوص اور محبّت کی بجائے خشک سا سرکاری پن تھا۔

رچرڈ نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اُس نے برمی زبان سیکھ لی تھی جس سے اُس کی مہم قدرے آسان ہو گئی تھی۔ اُس نے برما میں برطانوی سفارت خانے کی وساطت سے تھانگ دُو تک پہنچنے کا اہتمام کیا تھا۔ سفارت خانے کی سیکرٹری نے اسے اس علاقے میں اتنی رقم لے جانے سے روکا تھا اور اسے سختی سے کہا تھا کہ اپنے ارادوں کو دل سے نکال دے کیونکہ شمالی برما کے جنگل رہزنوں اور ڈاکوؤں سے بھرے پڑے تھے مگر رچرڈ نے اُس کی ایک نہیں سُنی تھی۔ وہ اپنے ضمیر کے ناگوار بوجھ سے آزاد ہونے کے لیے یہ رقم تھانگ دُو پر قربان کر دینے وہاں ضرور جانا چاہتا تھا۔ سیکرٹری نے اُس کے جنون سے متاثر ہو کر برمی حکومت سے اُسے تھانگ دُو تک کے سفر اور وہاں کے قیام کی سہولت دلا دی تھی۔

مانگ پے اُسے گاؤں میں لے گیا۔

گاؤں میں داخل ہوتے ہی رچرڈ کا دل اچھل اچھل کر باہر آنے لگا۔ اُس کے جی میں آئی کہ وہ اپنے سینے کا غبار وہیں مانگ پے کے سامنے اُگل دے۔ کانٹا جو ضمیر میں چُبھا ہُوا تھا اُس کی خلش یک لخت شدید اور زہریلی ہو گئی لیکن مانگ پے تیز قدم آگے آگے چلا جا رہا تھا۔ یہ برمی نمبردار سرکاری فرض ادا کر رہا تھا ورنہ اُس

کا انداز بتا رہا تھا کہ اُسے اِس انگریز کے ساتھ ذرہ بھر دلچسپی نہیں۔

ساون کا مہینہ تھا۔ مہمان خانے کے جھونپڑے میں پہنچنے سے پہلے ہی بارش برسنے لگی۔ دونوں بھاگ کر مہمان خانے کی چھ سیڑھیاں پھلانگ گئے۔

اندر بانسوں کا پلنگ بچھا تھا۔ رچرڈ تھک گیا تھا۔ وہ پلنگ پر جا گرا اور پلنگ چرچرا کر خاموش ہو گیا۔

رچرڈ کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ مانگ پے نے جذبات سے خالی لہجے میں کہا — "میں ابھی پانی بھیج دوں گا۔ ہم غریب لوگ ہیں۔ جو کچھ میسّر ہے حاضر کریں گے۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دینا۔"

وہ باہر کو چلنے لگا تو رچرڈ نے پوچھا "تم کب سے اس گاؤں کے نمبردار ہو؟"

"پندرہ برس سے"— مانگ پے نے کہا — "پہلے میرا باپ نمبردار تھا جنگ کے دوران میرے باپ کو گولی مار دی گئی تھی۔ پھر مجھے نمبردار بنا دیا گیا تھا۔"

"اُسے گولی جاپانیوں نے ماری تھی؟" —— رچرڈ نے پوچھا۔

"نہیں"— مانگ پے نے کہا —— "ایک انگریز نے"— اُس کے لہجے میں طنز کا رنگ نمایاں ہو گیا۔ اُس نے قدرے بے رُخی سے کہا "میں جا رہا ہوں۔ آپ سے شام کے کھانے کے وقت آجاؤں گا"— وہ ذرا سا جُھکا اور باہر نکل گیا۔

رچرڈ کا دل ڈوبنے لگا۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ اس شخص کا سامنا نہیں کر سکے گا۔ مانگ پے کی شخصیت میں کچھ ایسا اثر تھا کہ وہ گھبرانے لگا تھا یا شاید اُس کا ضمیر نگلے ہوئے زہر کو اُگلنے کو بے تاب تھا کہ رچرڈ کا دم گھٹنے لگا۔ اُس نے کپڑے بدلے۔ بارش اور تیز ہو گئی۔ یہ چینڈون کی وادی تھی جہاں ساون میں سمندر کا منظر بن جایا کرتا تھا۔ بارش کا شور بڑھا تو رچرڈ نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ اُس نے اپنے آپ میں ہسٹیریا کے دورے کی کیفیت محسوس کی۔ اُس نے جلدی سے اپنے بیگ سے وِسکی کی بوتل نکالی اور کارک کھول کر مُنہ سے لگا لی۔

اُسے پندرہ برس پہلے کا وہ وقت یاد آنے لگا جب وہ زیادہ نفری کی ایک

لڑاکا گشتی پارٹی لے کر اس علاقے میں جاپانیوں کی تلاش میں آیا تھا۔ یہ برما کی جنگ کی مُہم بے حد خطرناک تھی۔ وہ برطانوی ہند کی فوج میں میجر تھا۔ ڈویژن ہیڈکوارٹر کو اطلاعیں مل رہی تھیں کہ چینڈون کی وادی میں جاپانی داخل ہو رہے ہیں اور بغیر کسی مزاحمت یا لڑائی کے دیہات پر قابض ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ڈویژن ہیڈکوارٹر سے خاص طور پر رچرڈ کو حکم ملا تھا کہ وہ برطانوی عہدیداروں اور ہندوستانی سپاہیوں کی ایک مضبوط اور منتخب گشتی لڑاکا پارٹی لے کر چینڈون کے دیہات میں جائے اور جاپانیوں کو تباہ بھی کرے اور ان کی نقل و حمل کے متعلق معلومات بھی فراہم کرے۔

رچرڈ کو نمبر ۱۸ بلوچ رجمنٹ کے پٹھانوں پر بہت بھروسہ تھا۔ اس کے بعد اسے سکھوں پر بھروسہ تھا۔ اُس نے زیادہ تر آدمی بلوچ رجمنٹ سے لیے جن میں ایک آفریدی جمعدار دوست محمّد بھی تھا۔ جمعدار دوست محمّد نے رچرڈ کو چُنے ہوئے مسلمان سپاہی دیے تھے جن میں اکثریت پٹھانوں کی تھی۔ رچرڈ نے اپنے طور پر پٹیالہ سکھ رجمنٹ کی ایک کمانڈو سیکشن بھی ساتھ لے لی تھی۔

رچرڈ نے جب پٹھانوں اور سکھوں کی اس قلیل سی فورس کو دیکھا تو اُس کے دل سے تمام خدشے دُور ہو گئے تھے۔ پھر اُس نے اپنے ایک انگریز لیفٹیننٹ، ایک انگریز سارجنٹ میجر اور برما انٹیلی جنس کور کے ایک افسر کیپٹن راسن کو ساتھ لے لیا تھا۔ اُس وقت رچرڈ برمی زبان سے ناآشنا تھا۔ راسن برمی زبان خوب سمجھتا اور بولتا تھا مگر پہلے روز ہی رچرڈ نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ نہ کیپٹن راسن کو اچھا لگتا ہے نہ کیپٹن راسن اُس کی پسند کا افسر ہے حالانکہ دونوں برطانوی تھے۔ دونوں میں جنگ کے متعلق اختلاف رائے پیدا ہو گیا تھا۔ کیپٹن راسن صاف گو انسان تھا اور اس خیال کا حامی کہ جنگ میں شہریوں پر ظلم و تشدّد نہیں ہونا چاہیئے نہ ان کے گاؤں برباد ہونے چاہئیں لیکن رچرڈ کہتا تھا کہ ہمیں جنگ لڑنی ہے۔ دیہات کے لوگ مارے جاتے ہیں تو مارے جائیں، ہمیں پروا نہیں۔

بہرحال رچرڈ کو آفریدی جمعدار دوست محمّد پر پورا بھروسہ تھا اور وہ جانتا تھا کہ دوست محمّد کے پٹھان سپاہی اُسے کہیں بھی دھوکہ نہیں دیں گے۔

رچرڈ اپنی اس فورس کو لے کر چل پڑا۔ ان کے پاس اسلحہ بارود، راشن اور

دیگر جنگی سامان کی کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ دریائے چندوِن کے کنارے کنارے موسلا دھار بارش میں چلتے چلے گئے۔ راستے میں انہیں جاپانی فوج کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ انہوں نے اڑتالیس گھنٹوں میں اس قدر دشوار گذار سفر کے چالیس میل طے کر لیے۔ وہ گھنے جنگل اور دلدل میں جگہ جگہ پوزیشن لے کر جاپانیوں کو ڈھونڈتے رہے۔ رچرڈ کو اب یہ خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ جاپانی انہیں دیکھ کر دبک گئے ہیں اور اس کی پارٹی کو گھیرے میں لے رہے ہیں۔

دُور، بہت دُور سے، توپوں اور ٹینکوں کے دھماکے سنائی دے رہے تھے۔

کبھی کبھی لڑاکا بمبار طیارے اُن کے اوپر سے گزر جاتے تھے۔ سارا برما جنگ کے جہنم میں جل رہا تھا مگر جہاں رچرڈ اپنی چھوٹی سی فوج کو لیے گھوم پھر رہا تھا وہاں جاپانیوں کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔

وہ آگے رینگتے، سرکتے، کبھی چلتے کبھی رُکتے بڑھتے گئے۔ راستے میں چھوٹے چھوٹے تین چار گاؤں آئے۔ رچرڈ نے ہر گاؤں کے آدمیوں کو اکٹھا کر کے کیپٹن راسن سے کہا کہ ان سے جاپانیوں کے متعلق پوچھے۔ راسن نے ان سے برمی زبان میں پوچھا اور رچرڈ نے راسن کی وساطت سے ان پر جرح بھی کی لیکن رچرڈ نے شدت سے محسوس کیا کہ کیپٹن راسن اس کام میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہا بلکہ دیہاتیوں کی پُشت پناہی کر رہا ہے۔

وہ اور آگے بڑھے۔ کئی دن گزر گئے تھے۔ رچرڈ اپنے ڈویژن ہیڈ کوارٹر کو وائرلیس پر رپورٹیں دے رہا تھا۔ آخر وہ اس گاؤں تھانگ دُو سے دو اڑھائی میل دُور ایک اور گاؤں میں پہنچے۔ رچرڈ نے گاؤں کے نمبردار کو بلایا اور کیپٹن راسن سے کہا کہ وہ اس بوڑھے سے وہی سوال پوچھے جو وہ ہر گاؤں میں پوچھتا آیا ہے۔

راسن نے نمبردار کے ساتھ چند ایک باتیں کیں اور اُس کے جواب سُنے اور رچرڈ سے کہا کہ یہ شخص قسمیں کھاتا ہے کہ اس گاؤں کے لوگوں نے کبھی کسی جاپانی کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ نمبردار نے یہ بھی کہا کہ آپ اس گاؤں کو چھوڑ دیں، میں یقین سے کہتا ہوں کہ اس سارے علاقے میں کبھی کوئی جاپانی نہیں آیا۔

رچرڈ نے راسن کی زبانی یہ جواب سُنا تو اُس نے غصے سے بپھر کر راسن سے کہا ـــ "یہ بوڑھا جھوٹ بکتا ہے۔ ڈویژن ہیڈ کوارٹر کے پاس سکاؤٹس

کی رپورٹ پہنچ چکی ہے کہ اس علاقے میں جاپانی داخل ہو چکے ہیں۔ دوسل کے علاقے میں جاپانیوں کی موجودگی یقینی ہے۔"

"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ ڈویژن ہیڈ کوارٹر کو کیا رپورٹ ملی ہے۔" کیپٹن راسن نے رُوکھے پھیکے سے لہجے میں کہا ـــ "میں اسی قدر جانتا ہوں کہ یہ شخص جھوٹ نہیں بول رہا۔"

"کیپٹن راسن! تم دانشمندی سے گریز کر رہے ہو" ـــ رچرڈ نے کہا ـــ "لیکن میرے ساتھ آفریدی جمعدار دوست محمد ہے۔ یہ میرا مسئلہ حل کر لے گا۔"

جمعدار دوست محمد کے علاوہ اُسے اپنے برطانوی لیفٹیننٹ اور سارجنٹ میجر پر بھی بھروسہ تھا۔ کیپٹن راسن کا وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا کیونکہ راسن انٹیلی جنس کا افسر تھا۔

"اس سے تمہارا مطلب کیا ہے کہ جمعدار دوست محمد تمہارا مسئلہ حل کر لے گا؟" ـــ راسن نے قدرے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"مطلب یہ ہے کہ یہ جنگ ہے" ـــ رچرڈ نے تحکمانہ لہجے میں جواب دیا ـــ "جنگ میں ہر فعل روا ہے۔ برمیوں پر بھروسہ کرنا حماقت ہے۔ میں جانتا ہوں کہ جاپانی جب کسی سے کوئی بات اگلوانا چاہتے ہیں تو وہ اُسے اذیت دیتے ہیں، اسی طرح ہمیں بھی ان برمیوں کو اذیت دینے کا حق حاصل ہے۔"

"اور تم نازیوں اور فسطائیوں کے ظلم و تشدّد کے خلاف جنگ لڑ رہے ہو" ـــ راسن نے اب کے نمایاں طنز سے کہا ـــ "اور خود ظلم و تشدّد کے قائل ہو۔"

"بہرحال اس پارٹی کا کمانڈر میں ہوں" ـــ رچرڈ نے کیپٹن راسن سے کہا ـــ "میرا ہر حکم مانا جائے گا۔ اس آدمی سے کہو کہ اپنے گھر چلا جائے اور میری اجازت کے بغیر گھر سے باہر قدم نہ رکھے ورنہ میں اسے گولی سے اُڑا دوں گا۔"

رچرڈ نے اپنی پارٹی کو وہیں آرام کرنے کو کہا۔

شام کے کھانے سے فارغ ہو کر رچرڈ نے کیپٹن راسن سے کہا ـــ "جاؤ اور اُس بوڑھے نمبردار سے کہہ دو کہ تم خوش قسمت ہو۔ میں اس سے اور کوئی بات نہیں پوچھوں گا لیکن اُسے خبردار کر دو کہ اگر اُس نے اس طرح کا ایک اور جھوٹ بولا تو میں نہ صرف اُسے گولی مار دوں گا بلکہ گاؤں کے تمام جھونپڑوں کو آگ لگا دوں گا۔"

کیپٹن راسن خاموشی سے گاؤں میں چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد واپس آ گیا۔ وہ دوسرے دن بھی وہیں رہے۔ رچرڈ نے بلوچ رجمنٹ کے مسلمان سپاہیوں کی ایک گشتی پٹرول پارٹی بھیجی جو جنگل کی تلاشی لے کر لوٹ آئی۔ رچرڈ اپنی تمام پارٹی کو تھانگ ڈو کے گاؤں کے قریب لے گیا اور رات وہیں قیام کیا۔ بارش تھم گئی تھی۔

صبح ہوئی تو گردوپیش کا منظر بہت خوبصورت تھا، مگر قدرت کے حُسن پر جنگ کا آسیب سوار تھا۔ جاپان کی فوج برما کے جنگلوں اور دیہات میں بکھری ہوئی تھی۔

سورج اُبھرا تو لوگ کھیتوں میں کام کرنے کو نکل آئے۔ رچرڈ تھانگ ڈو کو پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ یہاں بہت سے جھونپڑے تھے اور ہر جھونپڑا موٹے موٹے بانسوں کے چبوترے پر ایستادہ تھا۔ اس سے کچھ دُور پرے دریائے چندوِن غرّا رہا تھا۔ رچرڈ، کیپٹن راسن اور اپنے لیفٹیننٹ کو ساتھ لے کر گاؤں میں داخل ہُوا۔ لوگوں نے کام کاج چھوڑ دیا اور ہنستے مسکراتے، دوستانہ انداز سے ان کی راہ میں آن کھڑے ہُوئے۔

رچرڈ کو اطمینان ہُوا۔ ان میں ایک موٹا سا آدمی آگے بڑھا اور کیپٹن راسن سے باتیں کرنے لگا۔ کیپٹن راسن نے اس کی باتوں کا ترجمہ کر کے رچرڈ کو بتایا کہ یہ آدمی اس گاؤں کا نمبردار ہے اور یہ کہتا ہے کہ ہمارے ہاں ایک مہمان خانہ ہے۔ آپ وہاں قیام کر سکتے ہیں اور ہم حسبِ توفیق آپ کی خدمت کریں گے۔

رچرڈ نے یہ پیش کش قبول کر لی اور سب افسر مہمان خانے میں چلے گئے، لیکن رچرڈ نے دیکھا کہ جمعدار دوست محمّد برمی نمبردار کو گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ رچرڈ نے احتیاطی تدبیر اختیار کرتے ہوئے پٹھان سپاہیوں کو گاؤں کے گرد پھیلا دیا تاکہ وہ گردوپیش کے خطرات پر نظر رکھیں۔ کیپٹن راسن نے رچرڈ سے کہا کہ دیکھا یہ لوگ کس قدر قابلِ اعتبار ہیں؟ رچرڈ کو قائل ہونا پڑا۔ راسن نے رچرڈ کو بتایا کہ میں اس سے جاپانیوں کے متعلق پوچھ چکا ہوں اور اس نے مجھے یقین دلایا ہے کہ دُور دُور تک کوئی جاپانی نہیں ہے۔

شام کا وقت تھا۔ رچرڈ باہر نکل گیا۔ وہ تھکن کو منظر کی خوبصورتی سے دُور کرنا چاہتا تھا۔ وہ دریا تک چلا گیا۔ واپس آیا تو شام کا دھندلکا گہرا ہو رہا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ گاؤں کے باہر تاڑ کے درختوں تلے ایک نوجوان لڑکی کھڑی تھی۔ وہ ایک درخت کا سہارا لیے ہُوئے تھی۔ اس کا لباس برمی، خدوخال برمی اور انگ انگ برمی تھا۔ اس وقت تک رچرڈ جانے کتنی برمی لڑکیوں کو دیکھ چکا تھا، لیکن یہ پہلی لڑکی تھی جس نے اُس کے قدم روک لیے۔ لڑکی کے انداز میں کشش تھی۔ ایسی کشش کہ رچرڈ جیسا ذمّہ دار افسر اُس کی طرف چل پڑا اور لڑکی کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔

رچرڈ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور اُس نے ٹوٹی پھوٹی برمی زبان میں لڑکی سے بڑے پیار سے کہا ”میں تمہارا دوست ہوں۔ تمہارا نام کیا ہے؟“

لڑکی کچھ بڑبڑائی اور گھوم کر شام کے دھندلکے میں غائب ہو گئی۔ رچرڈ نے اپنے اندر لذّت آگیں سی ہلچل محسوس کی اور وہ بے خیالی میں چل پڑا۔ اُس کے خیال پر یہ نوجوان برمی لڑکی قابض ہو گئی تھی۔ وہ اسی کے سحر کے اثر سے چلا جا رہا تھا کہ ایک رائفل کی نالی اُس کے پیٹ میں آ لگی۔ اُس نے چونک کر دیکھا۔ نالی فوراً ایک طرف ہو گئی۔ یہ پٹیالہ سکھ رجمنٹ کے ایک سپاہی کی رائفل تھی۔ یہ سکھ سپاہی ایک جھاڑی میں پوزیشن لیے ہُوئے تھا۔ رچرڈ اس گوری چٹی، دلکش برمی لڑکی کے تصور سے بیدار ہو گیا۔

وہ مہمان خانے میں چلا گیا۔ رات بھر وہ کروٹیں بدلتا رہا اور اس کا ذہن تلخ و شیریں خیالات کی آماجگاہ بنا رہا۔ اُسے گردوپیش سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ بلوچ رجمنٹ کے پٹھان اور کمانڈو سیکشن کے سکھ سپاہی بیدار ہیں۔

☼

آج پندرہ برس بعد، وہ پھر اسی گاؤں کے اسی مہمان خانے میں بیٹھا تھا اور تھانگ ڈو کی اُس رات کو یاد کر رہا تھا جب وہ جاپانیوں کی تلاش میں یہاں آیا تھا اور اس برمی لڑکی کو دیکھا تھا۔ اُسے یاد آ رہا تھا کہ جنگ ختم ہوتے ہی اُس کی ملازمت کا عرصہ بھی پُورا ہو گیا تھا۔ وہ فوج سے فارغ ہو کر بمبئی کی بندرگاہ سے انگلینڈ گیا تھا جہاں اُسے ایک کاروباری فرم میں ملازمت مل گئی تھی۔ وہ محنتی آدمی تھا۔ تھوڑے

ہی عرصے میں وہ اس فرم کا حصّہ دار پھر ڈائریکٹر بن گیا تھا اور اس کا شمار انگلینڈ کے دولتمندوں میں ہونے لگا تھا۔ وہ برما کو بھولتا چلا جا رہا تھا مگر ایک رات جب اس نے سونے سے پہلے سونے کے کمرے کی بتّی بجھائی تو اُس نے محسوس کیا جیسے کمرہ دھوئیں سے بھر گیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے تڑاخ تڑاخ کی آوازیں سُنیں جیسے خشک بانس جل رہے ہوں۔ اُس نے اُٹھ کر بتّی جلانی چاہی مگر اُس کے دل کو بھیانک سے خوف نے دبوچ لیا۔ وہ بستر سے اٹھ نہ سکا جیسے کسی آسیبی قوت نے اُسے دبوچ لیا ہو۔ کمرہ دھوئیں سے بھرتا رہا اور خشک بانس جلتے رہے۔

پھر عجیب بات یہ ہُوئی کہ اُس کی آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو صبح طلوع ہو چکی تھی۔ کمرے میں دُھواں نہیں تھا۔ باہر نکل کر دیکھا۔ کہیں بھی کوئی چیز نہیں جلی تھی۔ پھر اسے کیا ہُوا تھا؟ کیا یہ ڈراؤنا خواب تھا؟ اُس نے اسے خواب سمجھ کر ہی ذہن سے اُتار دیا لیکن دو ہی روز بعد وہ ایک ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا کہ اسے ہوٹل میں دُھواں بھرتا ہُوا محسوس ہُوا اور بانسوں کے جلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی دل پر ایسا خوف طاری ہو گیا کہ وہ کرسی پر جکڑا گیا۔

اُسے آج یاد آرہا تھا کہ ہوٹل میں ایک آدمی دوسری میز سے کھانا چھوڑ کر بھاگا آیا اور اُس سے پوچھا تھا ـــ "آپ ٹھیک تو ہیں؟ آپ کا رنگ زرد ہو گیا ہے اور اس ٹھنڈ میں آپ کا چہرہ پسینے میں ڈوب گیا ہے۔"

اُسے کچھ یاد نہیں تھا کہ اُس نے کھانا کھایا تھا یا نہیں اور بِل کسی نے ادا کیا تھا یا نہیں اور وہ اپنے گھر تک کس طرح پہنچا تھا۔ گھر میں وہ تنہا رہتا تھا۔ عمر پینتالیس برس ہو چلی تھی مگر ابھی شادی نہیں کی تھی کیونکہ اُس کے ذہن میں بیوی کا جو تصوّر اور جو معیار تھا اُس پر کوئی لڑکی پوری نہیں اُترتی تھی۔ وہاں لڑکیوں کی تو کوئی کمی نہیں تھی۔ اُس کے پاس دولت بے شمار تھی لیکن وہ ایسی لڑکی کی تلاش میں بھٹکتا رہا جو اُس کے جذبات سے دلچسپی رکھتی ہو مگر ایسی کوئی لڑکی نظر نہ آئی۔

ہوٹل میں اس دورے نے اُسے پریشان کر دیا۔ اُسے اُس رات بھی نیند میں بانسوں کے جلنے کی بھیانک تڑاخ تڑاخ سُنائی دی اور کمرے میں دُھواں محسوس ہُوا۔ دوسرے روز وہ اپنے ایک دوست ماہرِ نفسیات کے پاس چلا گیا اور اسے

یہ کیفیت سنائی اور اُسے بتایا کہ وہ برما میں جنگ کے وقت سے ضمیر پر ایک گناہ کا بوجھ لیے پھرتا ہے اور یہ بوجھ اب چند برسوں بعد اچانک زہر بن کر اُبھر آیا ہے۔

ماہرِ نفسیات نے اُسے مشورہ دیا کہ دَورے کی اس کیفیت سے نجات حاصل کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ وہ برما کے اُسی گاؤں میں جا کر گناہ کا کفّارہ ادا کرے اور ضمیر کے بوجھ کو وہاں پھینک آئے۔

یہ علاج تو اس سے پہلے رچرڈ کے دماغ میں بھی آیا تھا۔ اب نفسیات کے ڈاکٹر کی تائید حاصل ہو گئی تو اُس نے تمام تر دولت سمیٹی، پاسپورٹ بنوایا اور برما پہنچا جہاں سے وہ تھانگ دُو چلا گیا۔



اور آج وہ پھر اُسی مہمان خانے میں بیٹھا تھا جہاں وہ پندرہ برس پہلے میجر کی حیثیت سے اپنی لڑاکا گشتی پارٹی کے ساتھ جاپانیوں کی تلاش میں آن بیٹھا تھا۔ اس سے وہ گناہ اسی گاؤں میں سرزد ہُوا تھا جو جلتے ہوئے بانسوں اور دُھوئیں کی صورت میں اس کے ذہن و دل کو برسوں ڈستا رہا تھا۔ آج اُسے یاد آرہا تھا کہ وہ جنگ میں کس طرح بلوچ رجمنٹ کے پٹھانوں اور پٹیالہ سکھ رجمنٹ کی کمانڈو سیکشن کے سکھوں کے ساتھ یہاں پہنچا تھا۔

اُس نے آہ لی اور زیرِ لب کہا ـــ "کاش! مجھے جاپانیوں کی تلاش میں یہاں نہ بھیجا جاتا۔ میں محاذ پر کہیں لڑتا ہُوا مر جاتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔"

وہ یہیں تک یاد کر پایا تھا کہ وہ پٹھانوں اور سکھوں کے ساتھ یہاں آیا تھا کہ وہ اُکتا کر جھونپڑے سے باہر جا کھڑا ہُوا۔ اُس کے دل پر رنج و ملال کا بوجھ تھا۔ شام کا دُھندلکا پھیل رہا تھا۔ گاؤں کا نمبردار مانگ پے کہہ گیا تھا کہ شام کو آئے گا۔ رچرڈ سوچ رہا تھا کہ مانگ پے کے انداز میں دوستی نہیں بے رخی ہے۔ کیا اُسے دوست بنایا جا سکے گا؟ اگر مانگ پے نے تعاون نہ کیا تو اُس کے ارادے ملیامیٹ ہو جائیں گے اور وہ ضمیر پر گناہ کا بوجھ لیے مایوس و نامراد لوٹ جائے گا۔

رچرڈ باہر نکلا تو اُسے دائیں طرف ایک جھونپڑے کے کھنڈرات نظر آئے۔ بانسوں کا چبوترہ ایک طرف سے بیٹھا ہُوا تھا اور ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا اُسی طرف جھکا ہُوا تھا۔

شام کے گہرے دھندلکے میں اُس نے دیکھا کہ گھاس پھونس اور بانسوں کے اس کھنڈر کے قریب ایک عورت یا شاید جوان لڑکی گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی۔ بادل گھر کر آرہے تھے اور لڑکی گردوپیش سے بے خبر بیٹھی تھی۔

رچرڈ اُس کی طرف چلنے ہی لگا تھا کہ مانگ پے آگیا۔ اُس کے پیچھے پیچھے ایک عورت، ہاتھ میں ٹرے اٹھاتے آرہی تھی۔ رچرڈ ان کے ساتھ کمرے میں چلا گیا۔ عورت نے ٹرے بانسوں کی میز پر رکھی اور چلی گئی۔ یہ رچرڈ کا شام کا کھانا تھا۔ مُرغی اور چاول۔ مانگ پے بھی کوئی بات کیے بغیر کمرے سے نکلنے لگا تو رچرڈ نے کہا۔ "مانگ پے! تم نہ جاؤ، مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں.... بیٹھو، میرے ساتھ کھانا کھالو۔"

"میں کھا چکا ہوں" — مانگ پے نے بے رُخی سے جواب دیا۔

رچرڈ اُسے بہرطور روکنا اور اُسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ انگلینڈ سے یہاں کیوں آیا ہے۔ اُس نے مانگ پے کو وِسکی کی پیش کش کی جو اُس نے قبول کرلی۔ رچرڈ نے گلاس میں وِسکی ڈال کر اس کے آگے رکھ دی اور مانگ پے بیٹھ گیا۔

رچرڈ اُسے ساری آپ بیتی سُنا دینا چاہتا تھا لیکن مانگ پے کی خاموشی اور اُس کے لاتعلق سے رویّے میں کچھ ایسا تاثر تھا کہ رچرڈ اسی قدر کہہ سکا — "میں ایک مقصد لے کر یہاں آیا ہوں۔ اسی مقصد کے لیے میں نے برمی زبان سیکھی ہے۔ میں آج بہت تھکا ہُوا ہوں۔ تمہیں کل بتاؤں گا کہ میرا مقصد کیا ہے۔"

مانگ پے نے جذبات سے خالی لہجے میں کہا — "اچھا۔"

رچرڈ نے اس سے اُس لڑکی کے متعلق پوچھا جو جھونپڑے کے کھنڈر کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ مانگ پے نے اُسے بتایا کہ وہ تیس بتیس برس کی عمر کی عورت ہے۔ اس کا دماغ ٹھکانے نہیں۔ جنگ میں سبھی لوگ تباہ و برباد ہوگئے تھے۔ وہ پندرہ برسوں میں سنبھل گئے ہیں مگر جنگ نے جو اذیّت اس عورت کو دی ہے اس سے وہ ابھی تک نہیں سنبھل سکی اور نہ کبھی سنبھل سکے گی۔

رچرڈ نے اُسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو مانگ پے نے کہا — "اس کی اذیّت اُس روز شروع ہوئی تھی جس روز یہ گاؤں جلایا گیا تھا اور یہاں کے نمبردار یعنی میرے باپ کو گولی ماری گئی تھی۔"

"گاؤں کس نے جلایا تھا؟" — رچرڈ نے پوچھا۔

"ایک انگریز افسر نے" — مانگ پے نے کہا — "اُسی نے گاؤں کے نمبردار کو گولی مارنے کا حکم دیا تھا۔"

مانگ پے باہر نکل گیا۔ رچرڈ نے باہر جا کر دیکھا۔ مانگ پے اس عورت کو جھونپڑے کے کھنڈر کے قریب سے اٹھا کر اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔

رچرڈ کے سینے میں زہریلا نشتر اُتر گیا اور یہ الفاظ زہریلی بھڑوں کی طرح اس کے گرد بھنبھنانے لگے — "ایک انگریز افسر نے اس گاؤں کو جلایا تھا اور یہاں کے نمبردار کو گولی مارنے کا حکم دیا تھا۔"

وہ کمرے میں جا کے بیٹھ گیا اور اُسے پندرہ برس پہلے کی وہ رات یاد آنے لگی جب وہ اسی کمرے میں بیٹھا تھا۔ پٹھان اور سکھ سپاہی باہر گشت کر رہے تھے اور اُس شام اُس نے ایک حسین برمی لڑکی کو تاڑ کے درختوں تلے کھڑا دیکھا تھا۔ بے شک بانسوں کے اس جھونپڑے کی رات پُرسکون تھی، لیکن وہ جنگ کی ایک ہولناک رات تھی۔ رات کا پچھلا پہر تھا جب جمعدار دوست محمد نے اُسے جگا کر چائے دی تھی اور کہا تھا — "صاحب! آگے چلنے کا وقت ہوگیا ہے۔ ہمیں اندھیرے میں نکل جانا چاہیے۔"

رچرڈ نے سرعت سے چائے پی، وردی پہنی اور باہر نکل آیا تھا۔ بلوچ رجمنٹ اور پٹیالہ سکھ رجمنٹ کے سپاہی باہر تیار کھڑے تھے۔ ذرا پرے کیپٹن راسن اور گاؤں کا بوڑھا نمبردار دوستانہ طریقے سے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کھڑے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ رچرڈ کو یقین سا ہونے لگا کہ کیپٹن راسن برطانوی ہوتے ہوئے بھی برطانیہ کا خیرخواہ نہیں ہے۔

رچرڈ نے جلدی جلدی اپنی چھوٹی سی فورس کو اُردو میں ہدایات دیں اور انہیں اس طرح آگے بڑھایا کہ پٹھان آگے تھے، سکھ انہیں کور کرنے کے لیے پیچھے اور پہلوؤں میں۔ اور وہ خود اپنے لیفٹیننٹ، سارجنٹ میجر اور کیپٹن راسن کے ساتھ درمیان میں رہا۔ ساری پارٹی جنگل میں پھیل کر آگے بڑھنے لگی۔ جب رچرڈ گاؤں سے نکل رہا تھا تو اُس کے ذہن پر کل شام والی لڑکی سوار تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہ جھونپڑا کتنا خوش قسمت ہوگا جس میں اس لڑکی نے رات گزاری ہوگی اور وہ آدمی

کس قدر خوش نصیب، جس کی وہ بیوی یا محبوبہ ہوگی۔ اُس نے گھوم گھوم کے دیکھا، شاید جانے سے پہلے یا شاید کسی جاپانی کی گولی سے مرنے سے پہلے اُسے اس لڑکی کی ایک جھلک نظر آجائے، لیکن ابھی سحر کا دھندلکا چھٹا نہیں تھا اور لوگ جھونپڑوں میں گہری نیند سو رہے تھے۔

جب صبح کا اُجالا نکھر آیا تو رچرڈ کی پارٹی گھنے جنگل میں قدم پھونک پھونک کر رکھتی چلی جا رہی تھی۔ رچرڈ نے آگے آگے جاتے لمبے تڑنگے پٹھانوں پر نگاہ ڈالی پھر اُس نے اپنے دائیں پہلو میں سکھ رجمنٹ کے حوالدار گوربخش سنگھ کو دیکھا تو اُسے جاپانیوں پر رحم آنے لگا۔ اُس نے سوچا کہ یہ پٹھان اور یہ سکھ جاپانیوں کو چیر پھاڑ دیں گے۔

تھوڑی دیر بعد وہ جنگل سے نکل آئے۔ سامنے دھان کے کھیت تھے اور ان کھیتوں میں گھِرا ہُوا ایک اور گاؤں تھا۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ گاؤں کے باہر اور اندر کوئی انسان نظر نہ آتا تھا۔ وہ لوگ ابھی سوئے ہوئے تھے۔ رچرڈ نے جمعدار دوست محمد سے کہا کہ وہ اپنے مسلمان سپاہیوں سے گاؤں کو گھیرے میں لے لے اور سکھ مختلف سمتوں سے گاؤں میں داخل ہو کر لوگوں کو جگالیں اور گاؤں کے بڑے آدمی کو باہر لے آئیں۔

پٹھان گاؤں کو گھیرے میں لینے لگے تو رچرڈ نے سوچا کہ یہ تو وقت ضائع کرنے والی بات ہے۔ اس گاؤں میں جاپانی نہیں پہنچے۔ تھانگ دُو کے نمبردار نے یقین دلایا تھا کہ دُور دُور تک کے علاقے میں کوئی جاپانی نہیں ہے۔ رچرڈ نے اپنے لیفٹیننٹ سے مشورہ کر کے جمعدار دوست محمد سے کہا کہ اس گاؤں کو گھیرے میں لینے کی بجائے تین تین کی ترتیب میں اکٹھے گاؤں میں داخل ہو جاؤ۔ یہ ہدایت دیتے رچرڈ کو خیال آیا کہ گاؤں کی خاموشی کچھ پُراسراسی ہے تاہم اُس نے پٹھانوں کو پریڈ کی ترتیب میں گاؤں کی طرف روانہ کر دیا۔

پٹھان گاؤں سے کوئی پچاس گز دُور ہوں گے کہ ماحول رائفلوں اور مشین گنوں کے بے رحم دھماکوں اور "رٹ۔ ٹٹ۔ ٹٹ" سے لرز اٹھا۔ یہ فائر گاؤں کے اندر سے اور گاؤں کے پہلو میں ایک بلند جگہ سے جو جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھی، آرہا تھا۔

رچرڈ کا جسم سُن ہو کے رہ گیا۔ چند سیکنڈ تو وہ کچھ سوچ بھی نہ سکا۔ اُس نے دیکھا کہ جو پٹھان تین تین کی ترتیب میں سینے تان کر گاؤں کی طرف جا رہے تھے ان میں سے کئی ایک گولیوں کی بوچھاڑ میں گرے اور تڑپ کر ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ اتنے میں ایک گولی اُس کے اپنے پاؤں کے قریب زمین میں لگی۔ رچرڈ پر دیوانگی طاری ہو گئی۔ وہ جاپانیوں کے آتشیں جال میں پھنس چکا تھا۔ اُسے اپنی لغزش کا بھی احساس ہُوا۔ اُس نے پٹھانوں کو اندھا دھند گاؤں کی طرف بھیج دیا تھا۔

جو پٹھان پہلی بوچھاڑ سے بچ گئے تھے انہوں نے پوزیشنیں لے لیں اور جوابی فائر شروع کر دیا۔ عقب سے سکھوں نے پٹھانوں کے اوپر سے فائرنگ شروع کر دی۔ جاپانیوں کی دو ہی پوزیشنیں تھی۔ ایک مکان میں اور ایک باہر بلند جگہ پر۔ جب پٹھانوں نے دیکھا کہ سکھ انہیں نہایت اچھا حفاظتی فائر دے رہے ہیں تو جمعدار دوست محمد نے چلّا کر کہا ـــ "حوالدار گوربخش سنگھ! فائر ذرا اونچا کرو، ہم چارج کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے جمعدار صاحب!" ـــ گوربخش سنگھ نے عقب سے پکارا ـــ "چارج۔"

جمعدار دوست محمد اور اُس کے بچے کھچے پٹھانوں نے جاپانیوں کی بلندی والی پوزیشن پر سنگینوں سے ہلّہ بول دیا۔ سکھوں نے پٹھانوں کے پہنچنے تک نہایت کارگر فائر کر کے جاپانیوں کو دبائے رکھا۔ جونہی پٹھان جاپانیوں تک پہنچے سکھوں نے فائر روک دیا۔ پھر دست بدست جنگ کا گھمسان کا معرکہ ہُوا۔ پٹھانوں نے اپنی روایات کو زندہ کر دیا۔ سنگین کی لڑائی میں جاپانی بھی خوب ماہر تھے لیکن پٹھان اپنے پٹھان بھائیوں کے خون کے انتقام میں پاگل ہو گئے تھے۔ انہوں نے اس پوزیشن سے ایک بھی جاپانی کو زندہ بھاگنے نہ دیا۔

گاؤں کے اندر والی پوزیشن پر انگریز لیفٹیننٹ، انگریز سارجنٹ میجر اور سکھوں نے ایسا ہی حملہ کیا اور گرینیڈ پھینک کر اس پوزیشن کو بھی تباہ کر دیا۔ اس میں کم و بیش بیس جاپانی مارے گئے، لیکن رچرڈ کی پارٹی کا نقصان کچھ کم نہیں تھا۔ گیارہ پٹھان مارے گئے اور پانچ زخمی ہو گئے تھے۔ دو سکھ ہلاک اور دو زخمی ہوئے

تھے۔ انگریز لیفٹیننٹ دھان کے کھیت میں پڑا مر رہا تھا۔ گولی اُس کے سر سے پار ہوگئی تھی۔ سارجنٹ میجر گاؤں کے اندر اوندھے مُنہ پڑا تھا۔ اُس کے منہ سے خون نکل رہا تھا۔ رچرڈ نے اُسے اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ مرگیا۔

رچرڈ پٹھانوں کی طرف بھاگا۔

جمعدار دوست محمدؐ کے ایک گال سے خون بہہ رہا تھا۔ اُس نے قہرآلود لہجے میں رچرڈ سے کہا — "میجر صاحب! دشمن ہمارے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ ہم آرہے ہیں۔ تھانگ ڈو کے نمبردار کو بھی معلوم تھا۔ یہ اُس کی چال تھی۔ یہ گھات تھانگ ڈو کے نمبردار نے لگوائی ہے۔"

رچرڈ نے بلاتامّل اُس کی بات مان لی اور جب اُس نے گیارہ پٹھانوں، دو سکھوں اور دو انگریزوں کی لاشوں کو دیکھا تو غصّے سے اُس کے منہ سے جھاگ پھوٹنے لگی۔ اُسے ان جوانوں پر بہت ناز تھا۔ اسے اپنے ہم وطن افسروں پر اتنا بھروسہ نہیں تھا جتنا پٹھانوں پر تھا۔

"جمعدار صاحب!" — اُس نے عتاب آلود آواز میں جمعدار دوست محمدؐ سے کہا — "جس قدر جلدی ہوسکے تھانگ ڈو پہنچو اور نمبردار کو زندہ پکڑلو اور گاؤں والوں سے کہو کہ جو کوئی گاؤں سے باہر نکلا اُسے گولی ماردی جائے گی۔"

رچرڈ نے چند ایک سپاہیوں کو زخمیوں کی مرہم پٹی اور لاشوں کو دفن کرنے کے لیے اپنے ساتھ رکھا اور باقی سب کو جمعدار دوست محمدؐ کے ساتھ بھیج دیا۔ دوست محمدؐ کے جانے کے بعد اُس نے گاؤں کے تمام گھروں کی تلاشی لی تو اُسے پتہ چلا کہ گاؤں میں جاپانیوں کے سوا اور کوئی آدمی نہیں تھا۔ نہ کوئی عورت نہ کوئی بچّہ۔ جاپانیوں نے گاؤں والوں کو گاؤں سے نکال دیا تھا۔

کیپٹن راسن بھی جمعدار دوست محمدؐ کے ساتھ چلا گیا تھا۔ رچرڈ نے اُسے سختی سے کہا تھا کہ وہ جمعدار دوست محمدؐ کے کام میں دخل نہ دے۔

تین گھنٹے بعد رچرڈ بھی تھانگ ڈو پہنچ گیا۔ ایک پٹھان سپاہی اُسے نمبردار کے گھر لے گیا۔ دوست محمدؐ، کیپٹن راسن اور گوربخش سنگھ چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور نمبردار ایک کونے میں بیٹھا ہُوا تھا۔ اُس کے ہاتھ پیٹھ پیچھے بندھے ہوئے

تھے۔ رچرڈ کو دیکھتے ہی اُس نے برمی زبان میں غصّے سے بولنا شروع کردیا۔

"میجر رچرڈ!" — کیپٹن راسن بولا — "اس بوڑھے کے ہاتھ کھول دو۔ یہ سلوک اچھا نہیں ہے۔"

"میں پندرہ لاشیں دفن کرکے آیا ہوں" — رچرڈ نے غصّے پر قابو پاکر جواب دیا — "راسن! میں جو کہتا ہوں وہ اس سے پوچھو۔"

بوڑھے سے کہا گیا کہ اُسے معلوم تھا کہ اس گاؤں میں جاپانی موجود ہیں اور اُس نے جاپانیوں کو پہلے سے خبردار کردیا تھا۔

بوڑھے نے اس الزام کی تردید کی تو جمعدار دوست محمدؐ نے گرج کر کہا — "جھوٹ بکتا ہے۔ اسے معلوم تھا۔"

کیپٹن راسن نے رچرڈ سے کہا کہ تم لوگوں کے پاس اس بوڑھے کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔

رچرڈ نے سُنی اَن سُنی کرکے حکم دیا — "گاؤں کے تمام آدمیوں کو باہر بلاؤ اور اس بوڑھے کو بھی باہر لے آؤ۔"

حوالدار گوربخش سنگھ نے بوڑھے کو مُردار کی طرح گھسیٹ لیا پھر اُسے ٹھُڈ مار کر اٹھایا۔ رچرڈ کے دل میں بوڑھے کے لیے رحم کا ذرّہ بھی نہ تھا۔ کیپٹن راسن نے بوڑھے کی وکالت میں کچھ کہا۔

"میرے گیارہ پٹھان، دو سکھ ... دو انگریز مارے گئے ہیں۔"

قہر بھری آواز میں کہا۔

باہر گاؤں کے لوگ جمع ہوچکے تھے۔ بوڑھے کو سامنے کھڑا کرکے رچرڈ نے راسن سے کہا کہ انہیں بتاؤ کہ اس بوڑھے کا قصور کیا ہے اور انہیں کہو کہ گاؤں کے ہر ایک آدمی کو گولی ماری جائے گی اور سارا گاؤں جلا دیا جائے گا، لیکن میں تم پر رحم کرتا ہوں اور تم لوگوں کو عبرت دلانے کے لیے میں تھوڑے سے جھونپڑے جلاؤں گا اور صرف اس بوڑھے کو گولی ماروں گا۔

جب گاؤں والوں نے کیپٹن راسن کی زبان سے یہ سزا سُنی تو اُن پر سنّاٹا طاری ہوگیا۔ راسن نے رچرڈ کو اس ظلم سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن رچرڈ نے جمعدار

دوست محمد سے کہا — "جمعدار صاحب! اپنے ساتھ پانچ سپاہی لے لو اور پرے جا کر اس نمبردار کو گولی مار دو۔ اس کی لاش وہیں پڑی رہنے دینا۔"

جمعدار دوست محمد نے پانچ سپاہی چُن لیے اور نمبردار کو گھسیٹتے اور دھکیلتے ہُوئے پرے لے گئے۔ ایک بار رچرڈ کو نمبردار کی آواز سنائی دی جیسے بکرے کو ذبح کیا جا رہا ہو۔ رچرڈ کے دل پر پل بھر کے لیے خوف طاری ہو گیا اور اُس نے چاہا کہ بوڑھے کو بخش دے۔ اُس کا ضمیر جاگ اٹھا تھا۔ وہ شاید اسے بخش ہی دیتا مگر کیپٹن راسن بول پڑا۔

"رچرڈ! میں تمہیں آخری بار کہتا ہوں کہ انسانیت کا احترام کرو اور پاگل نہ بنو۔"

رچرڈ کو راسن سے چڑ تھی۔ اُس کے دل میں رحم کا جو جھونکا آیا تھا وہ نکل گیا۔

راسن نے کہہ دیا — "تم ہٹلر ہو۔"

عین اُس وقت ذرا پرے، جھاڑیوں کی اوٹ سے پانچ رائفلوں کا ایک دھماکہ سنائی دیا۔ نمبردار کو ایک نہیں، بیک وقت پانچ گولیاں مار دی گئی تھیں۔

"رچرڈ!" — کیپٹن راسن نے کہا — "تم مجرم ہو۔ شاید تمہیں اپنے جرم کا احساس بھی ہوگا۔"

رچرڈ کو آج پندرہ برس بعد یاد آ رہا تھا کہ کیپٹن راسن نے ٹھیک کہا تھا۔ میں مجرم تھا لیکن اپنے جرم کا احساس دیر بعد ہُوا، مگر اُس روز وہ غصے سے دیوانہ ہُوا جا رہا تھا۔ اُس نے نہ صرف بوڑھے نمبردار کو گولی مروا دی بلکہ سپاہیوں سے کہا تھا — "سامنے کے جھونپڑوں کی ساری قطار کو جلا دو۔"

"رچرڈ!" — کیپٹن راسن نے اُسے پھر کہا — "تم اسی ظلم و تشدد کے خلاف لڑ رہے ہو جس کے مرتکب تم خود ہو رہے ہو۔"

"خدا کے لیے خاموش رہو راسن!" — رچرڈ نے کہا۔

"تم ایک جرم کر چکے ہو، اب ایک اور نہ کرو۔" راسن نے اُس کا بازو تھام کر کہا — "ان لوگوں کے گھر نہ جلاؤ۔ یہی ان کی ساری کائنات ہے۔ ان غریبوں نے پیٹ پر پتھر رکھ کر یہ جھونپڑے کھڑے کیے ہیں۔ اس سے بہتر ہے کہ ان سب کو گولی مار دو ان کے گھر نہ جلاؤ، ان جھونپڑوں میں ان کا خون پسینہ لگا ہوا ہے۔ ان کے بچے بارش

میں پڑے ٹھٹھر ٹھٹھر کر مر جائیں گے۔" — رچرڈ خاموشی سے سنتا رہا مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہُوا۔ راسن نے کہا — "تم مجرم ہو۔"

"اور تم غدار ہو" — رچرڈ بھڑک اٹھا اور بولا — "تمہیں ذرّہ بھر احساس نہیں کہ میرے گیارہ پٹھان اور دو سکھ سپاہی ہلاک ہو گئے ہیں۔ اگر تمہیں ان سپاہیوں کا خیال نہیں تو ان دو انگریزوں کے متعلق ہی سوچو جو ان برمیوں کی چالبازی کی نذر ہو گئے ہیں۔ اگر اب تم نے میری راہ میں آنے کی کوشش کی تو میں تمہیں گرفتار کر کے ہیڈ کوارٹر میں کورٹ مارشل کے لیے بھیج دوں گا۔" — رچرڈ نے اپنے سپاہیوں سے مخاطب ہو کر کہا — "سامنے کے جھونپڑے جلا دو۔"

اور ذرا دیر بعد سامنے کے تین جھونپڑوں سے بے رحم شعلے اٹھنے لگے۔ جلتے ہوئے بانس مشین گن کی طرح تڑاخ تڑاخ کرنے لگے اور ماحول میں دھواں پھیلنے لگا۔

☼

آج پندرہ برس بعد اُس کو اسی گاؤں کے مہمان خانے میں بیٹھے وہ آگ یاد آ رہی تھی۔ یہی وہ آگ تھی جو انگلینڈ میں اُس کے لیے آسیبی دورہ بن گئی تھی۔ وہ اس سے آگے کچھ بھی یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اب ان یادوں سے پناہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اُس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ بے چینی سے سویا اور صبح ہو گئی۔

اُس نے کھڑکی کھول کر باہر دیکھا۔ درخت ساون کی اوس سے لدے ہوئے تھے اور اوس کے قطرے پتوں سے ٹپک رہے تھے۔ رچرڈ کو یوں لگا جیسے پیڑ رو رہے ہوں۔ اُس کا دل اداسیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ اگر مانگ پے نہ آ جاتا تو وہ رنج و الم سے شاید کبھی نہ اُبھر سکتا۔ مانگ پے نے رسمی سے لہجے میں اُسے سلام کیا اور پوچھا کہ رات اُسے کوئی تکلیف تو نہیں ہُوئی؟

رچرڈ اُس کے لہجے کو خوب سمجھتا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ مانگ پے اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر باہر کو چل پڑا تھا۔

"مت جاؤ مانگ پے!" — رچرڈ نے بے تاب ہو کر کہا — "میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔"

مانگ پے رُک گیا۔

"تمہیں شاید معلوم ہوگا کہ میں یہاں سیر و سیاحت کے لیے نہیں آیا"۔

رچرڈ نے کہنا شروع کیا — "میں اس گاؤں کو مالی امداد دینے آیا ہوں"۔ مانگ پے نے چونک کر رچرڈ کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ رچرڈ نے کہا — "تم نے بتایا تھا نا کہ ایک انگریز افسر نے اس گاؤں کو جلایا اور نمبردار کو گولی مروا دی تھی۔ وہ میرا دوست تھا.... وہ مر گیا ہے"۔

رچرڈ یہ جھوٹ بول کر اندر ہی اندر کانپ اٹھا لیکن سنبھل گیا اور کہنے لگا — "مرنے سے پہلے اُس نے مجھے تھانگ دُو کے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا۔ اُس نے فوج سے فارغ ہو کر بہت دولت کمائی تھی"۔

"اُس نے آپ کو کیا بتایا تھا؟" — مانگ پے نے پوچھا۔

"مختصر یہ کہ میرا دوست جنگ کے دوران یہاں ایک گشتی پارٹی لے کر آیا تھا۔ تمہارے گاؤں کے نمبردار نے اُسے یقین دلایا تھا کہ اس علاقے میں جاپانی نہیں ہیں، لیکن اگلے گاؤں میں جاپانی فوج موجود تھی جس نے میرے دوست کے پندرہ آدمی ہلاک کر دیئے۔ حالات ایسے تھے کہ میرے دوست نے غصّے میں آکر تمہارے گاؤں کے نمبردار کو جو تمہارا باپ تھا، گولی مروا دی اور گاؤں کے چند ایک جھونپڑے بھی جلا ڈالے تھے... مانگ پے! تم شاید نہیں جانتے کہ جنگ میں انسان پاگل ہو جاتا ہے اور وہ کچھ ایسی حرکتیں کر بیٹھتا ہے جن پر وہ جنگ کے بعد پچھتاتا ہے"۔

"ہو سکتا ہے نمبردار کا بھی اس میں ہاتھ ہو" — مانگ پے نے رچرڈ کو گہری نظر سے دیکھتے ہوئے کہا — "لیکن اُسے بغیر کسی ثبوت کے مروا دینا اچھا فعل نہ تھا"۔

"میرے دوست نے اُسے اچھا فعل اس لیے سمجھا تھا کہ نمبردار نے اُسے دشمن سے مروایا تھا" — رچرڈ نے کہا۔

"کونسا دشمن؟" — مانگ پے نے حیرت زدہ سا ہو کے پوچھا۔

"جاپانی۔ جاپانی تمہارے دشمن تھے" — رچرڈ نے کہا — "اور انگریز تمہارے دوست تھے کیونکہ وہ تمہارے ملک کو جاپانیوں سے بچانے کے لیے لڑے تھے"۔

"نہیں" — مانگ پے نے کہا — "دونوں ہمارے دشمن تھے۔ جاپان نے اس لیے برما پر حملہ کیا تھا کہ اس ملک پر قبضہ کرلے اور انگریز اس لیے لڑے تھے کہ

اس ملک کو اپنے قبضے میں رکھیں۔ ہمارے لیے دونوں دشمن تھے۔ ہمیں جاپانیوں نے بھی اذیتیں دے دے کر انگریزوں کے متعلق معلومات حاصل کیں اور انگریزوں نے بھی ہماری بستیاں جلا کر ہم سے جاپانیوں کے متعلق پوچھا"۔ مانگ پے نے لمبی آہ لی اور کہا — "یہاں سے دس میل دُور ایک گاؤں میں جاپانی آئے اور نمبردار کا پیٹ چاک کرکے سارے گاؤں کو جلا گئے کیونکہ نمبردار نے کہا تھا کہ اُسے انگریزوں کی فوج کے متعلق کچھ علم نہیں۔ چند دنوں بعد تمہارا دوست آیا اور ہمارے نمبردار کو قتل کروا کے ہماری بستی کو جلا گیا"۔

رچرڈ کے ماتھے پر پسینے کے قطرے پھوٹنے لگے۔ اُس کے پاس مانگ پے کی بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے موضوع بدل ڈالا اور پوچھا — "وہ عورت کہاں ہے جو رات اس جھونپڑے کے قریب بیٹھی تھی؟"

"یہیں ہے" — مانگ پے نے جواب دیا — "اُسے کسی طرح مصروف کرنے کے لیے میں نے اسے کہا ہے کہ وہ آپ کو دوپہر کا کھانا دے جائے"۔

رچرڈ پھر اپنے اصلی موضوع پر آگیا اور کہنے لگا — "میرا دوست مر گیا ہے۔ مرتے وقت اُس نے اپنی تمام دولت مجھے دے دی تھی اور کہا تھا کہ میں برما کے اس گاؤں تھانگ دُو جا کر یہ دولت یہاں کے لوگوں اور گاؤں کی ترقی کے لیے صرف کردوں۔ میں چاہتا ہوں مانگ پے! کہ تم میرے ساتھ تعاون کرو اور بتاؤ کہ یہ رقم یہاں کس طرح خرچ کردوں۔ شام تک مجھے سوچ کر جواب دینا"۔

مانگ پے اُٹھ کھڑا ہوا اور ایسے لہجے میں کہا — "اچھا" — جیسے اسے رچرڈ کی بات سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ اُس نے کہا — "دوپہر کا کھانا وہ دے جائے گی۔ شام کا کھانا بھی وہی لائے گی۔ میں اُس کے ساتھ آجاؤں گا"۔

"اُس کا نام کیا ہے؟" — رچرڈ نے پوچھا۔

"می ژِن" — مانگ پے نے جواب دیا اور باہر نکل گیا۔

رچرڈ کو اب سارا دن قیدِ تنہائی میں گزارنا تھا۔ گاؤں کا کوئی آدمی اُس کے قریب نہیں آتا تھا نہ کوئی اُس کی طرف دھیان دیتا تھا۔ وقت گزارنے کے لیے وہ اس ارادے سے باہر نکلا کہ دریا تک گھوم آئے گا۔ اُسے جھونپڑے کے کھنڈر کے

پاس وہی عورت بیٹھی نظر آئی۔ وہ چہرہ گھٹنوں اور بازوؤں میں دیئے بے حس بیٹھی تھی جیسے کوئی بُت رکھا ہُوا ہو۔ ساون کی بوندا باندی شروع ہو گئی لیکن اس عورت کے جسم نے ہلکی سی جنبش بھی نہ کی۔ رچرڈ خراماں خراماں چلتا اُس کے پیچھے جا کھڑا ہُوا۔ عورت کے بھورے ملائم بال اُس کے گلابی گلابی کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ عورت نہیں نوجوان لڑکی دکھائی دے رہی تھی۔ رچرڈ اُسے کمرے میں لے جا کر اپنی پناہ میں لے لینے کو بے تاب ہونے لگا۔

رچرڈ نے آہستہ سے پکارا — "می ژن!"

گوشت پوست کا بُت ساکن رہا۔

رچرڈ نے اُس پر جھک کر ذرا بلند آواز سے پکارا — "می ژن!"

لڑکی کا جسم کانپا اور اُس نے نہایت آہستہ آہستہ گردن کو گھمایا۔ رچرڈ اُس کے چہرے کو اچھی طرح دیکھنے کے لیے آگے ہُوا۔ ایک تیر اُس کے دل سے پار ہو گیا اور اُس کے منہ سے نکل گیا — "اوہ میرے خدا!"

عورت کو اُس نے پہچان لیا تھا۔ یہ وہی حسین اور دلکش لڑکی تھی جسے اُس نے پندرہ برس گزرے، جنگ کے زمانے میں تاڑ کے درختوں تلے کھڑے دیکھا تھا۔ اُس کا چہرہ ایک طرف سے جُھلسا ہُوا تھا۔ رچرڈ نے اُسے چہرے کی دوسری طرف سے پہچانا تھا جو صحیح و سلامت تھا۔ اس کی پلکوں تلے جو جادو بھری آنکھیں تھیں، وہ غائب تھیں۔ وہ اندھی تھی۔

رچرڈ نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیے اور اُس کے ہونٹوں سے سسکیاں، پھر ہچکیاں نکلنے لگیں۔ وہ تیزی سے گھوما اور جلدی سے اپنے مہمان خانے میں آ گیا۔ اُس کا دل خوف کی بے رحم گرفت میں جکڑا گیا۔ ذہن کے کسی کونے سے دُکھ درد کی گھٹا اُٹھی اور اُس کی داخلی دنیا پر چھا گئی۔ وہ چارپائی پر گرا اور گھاس پھونس کی چھت کو گھورنے لگا۔

غم سے بوجھل ذہن پھر ماضی کی تلخیوں میں جا پہنچا۔ اُسے یاد آنے لگا کہ پندرہ برس پہلے جب اُس نے نمبردار کو گولی مروا کر صرف تین چار جھونپڑوں کو آگ لگانے کا حکم دیا تھا تو فوراً جھونپڑوں سے شعلے اُٹھنے لگے تھے۔ جانے کس نے کہا تھا — "جھونپڑوں کے اندر بچّے زندہ جل رہے ہوں گے"— لیکن رچرڈ کو انتقام نے پاگل کر رکھا

تھا۔ اُسے کسی پر رحم نہیں آ رہا تھا۔ گاؤں کے لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ شعلے بلند ہُوئے تو ہوا تیز ہو گئی جو شعلوں کو ان جھونپڑوں تک بھی لے گئی تھی جنہیں رچرڈ نے جلانے کا حکم نہیں دیا تھا۔ جلتے بانسوں کی تڑاخ تڑاخ سے کان پھٹ رہے تھے۔ یہ آوازیں ہولناک تھیں۔

ان میں ایک جھونپڑا دوسروں سے زیادہ خوبصورت اور مضبوط تھا۔ اس کی بانسوں کی بنی ہوئی دیواریں کاریگری کا دلکش نمونہ تھیں۔ بانسوں کے چبوترے کے نیچے موٹے بانسوں کے ستون بھی خوبصورت تھے اور چبوترے کے ساتھ نئی سیڑھی لگی ہوئی تھی۔ جب آگ اس جھونپڑے تک پہنچی تو گاؤں والوں کے روتے ہُوئے ہجوم میں سے ایک گڑیا سی لڑکی جھونپڑے کی طرف بھاگی۔ وہ چیخ رہی تھی۔ وہ سیڑھیوں پر جا چڑھی۔ جھونپڑا جل رہا تھا۔

دو جواں سال آدمی بھاگتے پہنچے اور لڑکی کو پکڑ لیا لیکن لڑکی سیڑھیاں چڑھ کر شعلوں کے قریب پہنچ چکی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ رچرڈ نے دیکھا۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے اُس نے تاڑ کے درختوں تلے کھڑے دیکھا تھا۔ دو طاقتور آدمی اُسے پوری طاقت سے پیچھے کھینچ رہے تھے لیکن لڑکی نے چبوترے کے بانسوں کے جنگلے کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔

رچرڈ نے بے اختیار چاہا کہ اپنے سپاہیوں کو کہے کہ تینوں کو اُٹھا لائیں ورنہ وہ جُھلس جائیں گے مگر جھونپڑا اچانک آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹ پڑا۔ ایسا دھماکہ ہُوا کہ دل دہل گئے۔ جھونپڑا ایک طرف سے جُھکا اور چبوترہ بیٹھنے لگا۔ وہ لڑکی اور اُسے بچانے والے گرتے ہُوئے چبوترے پر گرے اور شعلوں میں روپوش ہو گئے۔

رچرڈ کے دل سے ہُوک اٹھی اور اُس نے اپنے آپ سے کہا تھا — "میں نے انسانوں کو جلانے کا حکم نہیں دیا تھا"— مگر تین انسان شعلوں کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔

"اب خوش ہو رچرڈ؟" — کیپٹن راسن نے قہر آلود آواز میں رچرڈ سے کہا۔ رچرڈ اُس کی نظروں کا سامنا نہ کر سکا۔

وہ اپنے سپاہیوں کو ساتھ لیے ڈویژن ہیڈکوارٹر کی سمت چل پڑا۔ اس کے رگ و ریشے میں زہر سا سرایت کرتا چلا جا رہا تھا۔ اُس نے دُور آ کر گھوم کے دیکھا۔ گاؤں جل رہا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ وہ گیارہ پٹھانوں، دو سکھوں اور دو انگریزوں کی لاشوں کو یہاں چھوڑے جا رہا ہے۔ اس سے اُسے کچھ تسکین ہُوئی کیونکہ اس نے انتقام لیا تھا۔ وہ تین روز بعد دشوار گزار مسافت طے کر کے ڈویژن ہیڈکوارٹر پہنچا اور تمام تر رپورٹ دے کر گہری نیند سو جانے کے لیے اپنے کشادہ مورچے میں لیٹ گیا مگر نیند میں اسے جلتے ہوتے بانسوں کی تڑاخ تڑاخ سنائی دیتی رہی اور وہ کئی بار ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔



اِس سے آگے اُسے کچھ یاد کرنے کی ہمّت نہ ہوئی۔ یادیں بہت تلخ تھیں۔ اُسے آج پندرہ برس بعد لڑکی کا وہ چہرہ یاد آ رہا تھا جس نے اُس پر سحر طاری کر دیا تھا اور اس کا آج کا چہرہ جیسے کوئی بدرُوح گاؤں میں آن بیٹھی ہو۔ رچرڈ چارپائی سے اٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا اور سوچنے لگا کہ یہ عورت تو شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی تھی، بچ کیسے گئی تھی؟ اور وہ دو آدمی تو ضرور جل گئے ہوں گے جو اسے وہاں سے ہٹانے گئے تھے۔

دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ یہی عورت جس کا نام می ژن تھا، ہاتھ میں ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی اور اندھی ہونے کے باوجود جچے تلے قدم اٹھاتی کمرے کے وسط تک آئی۔ کھانا نیچے رکھا اور پیشتر اس کے کہ رچرڈ اسے ذرا سی دیر کے لیے روک کر چند باتیں کرتا وہ کمرے سے نکل گئی۔ رچرڈ کو ایسے محسوس ہوا جیسے می ژن نے اُس کے آگے کھانا اسی طرح رکھا ہو جس طرح کتے کے آگے پھینکا جاتا ہے۔ رچرڈ نے عہد کر لیا کہ وہ سب سے پہلے اس لڑکی کو ذہنی اذیت سے نجات دلائے گا۔

کھانے سے فارغ ہو کر رچرڈ باہر نکل گیا۔ گاؤں کے لوگ کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ وہ اُن کے قریب سے گزرا تو کسی نے اُس کی طرف توجّہ نہ دی۔ اُسے یاد تھا کہ انگریز کو دیکھ کر برمی لوگ اس کی راہ میں آن کھڑے ہوتے تھے مگر اب وہ اسے دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر رہے تھے۔ اس کے باوجود اُس نے اس عزم کو اور پختہ کر دیا کہ

وہ ان لوگوں کی کایا پلٹ دے گا۔ اُس نے دیکھا کہ جلے ہوئے جھونپڑوں کی جگہ جو نئے جھونپڑے کھڑے کیے گئے تھے وہ بھدے اور کمزور تھے۔ رچرڈ نے سوچا کہ وہ تمام جھونپڑوں کو گرا کر بانسوں اور آبنوس کی لکڑی کے نئے مکان بنائے گا جن میں الگ الگ کمرے ہوں گے، پھر انہیں مشینی کھیتی باڑی کا سامان منگوا دے گا اور انہیں غلّے کی تجارت کرنے کے ڈھنگ سکھائے گا۔ اُس کے پاس بے شمار دولت تھی جو وہ اسی مقصد کے لیے ساتھ لایا تھا۔ وہ گناہ کا کفّارہ ادا کرنا چاہتا تھا۔

وہ گاؤں کی فلاح و بہبود کے منصوبے بناتا جانے کہاں کہاں گھومتا رہا۔ جب مہمان خانے میں آیا تو شام کا دھندلکا گہرا ہو رہا تھا۔ دیکھا کہ کمرے میں چاول اور مرغی کی پلیٹیں پڑی تھیں۔ وہ کھانا کھا رہا تھا کہ مانگ پے آ گیا۔ رچرڈ اُس سے پوچھ نہیں سکتا تھا کہ یہ عورت تو جل گئی تھی، بچ کیسے گئی۔ اُس نے سوچا کہ اس کے منصوبے عملی شکل اختیار کر لیں تو وہ مانگ پے کو بتا دے گا کہ اس گاؤں کو جلانے والا وہی تھا۔

اُس نے مانگ پے سے پوچھا کہ اس عورت کو کیا ہُوا تھا؟ اس کا چہرہ جُھلسا ہُوا ہے۔ مانگ پے نے کہا کہ یہ اُسی آگ میں جھلس گئی تھی جو اس انگریز کے حکم سے لگائی گئی تھی۔

"یہ اُس وقت کمسن لڑکی تھی جب گاؤں کو آگ لگائی گئی تھی"۔ مانگ پے نے کہا۔ "دوسرے روز اس کی شادی ہونے والی تھی۔ جس جھونپڑے میں وہ جلی تھی وہ اُسے ماں باپ نے جہیز کے طور پر بنا دیا تھا۔ اس کے اندر ضرورت کی ہر چیز رکھی تھی۔ دوسرے روز اسے اپنے خاوند کے ساتھ اس جھونپڑے میں آباد ہونا تھا۔ وہ جھونپڑا اس کا حسین خواب تھا جسے ایک انگریز افسر نے جلا ڈالا اور وہ نہ صرف اندھی ہو گئی بلکہ اس کا دماغ ماؤف ہو گیا۔ اس کے سہاگ کا آشیاں جل رہا تھا۔ وہ اسے بچانے کو یا شاید اس کے ساتھ ہی جل مرنے کو بھاگی تو اس کا ہونے والا خاوند اور اس کا بھائی اسے بچانے کو اس کے پیچھے دوڑے۔ آخر ہُوا یہ کہ وہ دونوں جل کر مر گئے اور یہ لڑکی نہ جانے کیسے بچ گئی۔ اُس روز سے اس کے رشتے دار اسے دو وقت کا کھانا دے دیتے ہیں لیکن اسے رات کو اپنے گھر میں داخل نہیں ہونے دیتے۔

گاؤں والے اسے بدرُوح سمجھتے ہیں۔ میں اسے اپنے گھر لے جاتا ہوں اور وہ کونے میں دبک کر رات گزار لیتی ہے۔"

رچرڈ کے دل میں درد کی ٹیس اٹھی اور اس کا سر جھک گیا۔ ذرا دیر بعد اس نے سر اٹھا کر کہا — "سارا گاؤں جل گیا تھا؟"

"جہاں یہ گاؤں ہُوا کرتا تھا وہاں صرف راکھ رہ گئی تھی" — مانگ پے نے کہا — "پھر راکھ کو بارشیں بہا لے گئی تھیں۔ پھر یہاں نئے جھونپڑے کھڑے کیے گئے۔"

"یہ جھونپڑے بہت کمزور اور بھدّے ہیں" — رچرڈ نے کہا — "میں تم لوگوں کو لکڑی اور بانسوں کے مکان بنوا دوں گا اور گاؤں کو نہایت خوبصورت شکل دوں گا میرے دوست نے اس کام کے لیے مجھے بہت دولت دی ہے۔"

"نہیں، ایسا نہیں ہوگا" — مانگ پے نے کہا — "تھانگ ڈُو کے لوگ اب اچھے جھونپڑے نہیں بنائیں گے۔ یہ لوگ ڈرتے ہیں کہ کل تباہی آئی تھی، کل پھر آ سکتی ہے۔ ہم لوگ اب صرف جی رہے ہیں اور کھیتوں سے اتنا ہی اناج اگاتے ہیں جس سے ہمارے پیٹ بھر جاتے ہیں۔ جس طرح یہ لڑکی آنکھیں کھو بیٹھی ہے اسی طرح ہم اچھی زندگی بسر کرنے کی اُمنگ کھو بیٹھے ہیں۔"

رچرڈ نے اُسے قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ گاؤں کا نمبر دار ہے اور وہ اس کی پیش کش قبول کر لے۔ اُس نے مانگ پے سے یہ بھی کہا — "میں جانتا ہوں کہ تم ایک انگریز کی پیش کش قبول کرنے سے گریز کر رہے ہو کیونکہ تمہیں اُس سے نفرت ہے۔"

"کچھ سمجھ لو" — مانگ پے نے کہا — "اب ہزار خزانے ہمیں دے دو، جو مر گئے ہیں وہ لَوٹ کے نہیں آ سکیں گے اور تھانگ ڈُو کا جلا ہُوا سینہ انگلینڈ کی دولت سے کبھی ٹھنڈا نہ ہوگا۔"

"مانگ پے!" — رچرڈ نے دوٹوک لہجے میں کہا — "میں جس کام کے لیے یہاں آیا ہوں وہ کام ہو کر رہے گا۔ میں تمام عمر یہیں رہوں گا اور تم لوگوں پر زر و دولت قربان کرتا رہوں گا۔ سب سے پہلے اس اندھی لڑکی کو پناہ میں لینے کا بندوبست کروں گا۔"

مانگ پے نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اُٹھ کے چلنے لگا تو رچرڈ نے اُس سے ہاتھ ملانے کو ہاتھ بڑھایا مگر مانگ پے نے ہاتھ کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا اور باہر نکل گیا۔ رچرڈ کو دھچکا لگا لیکن اُس نے اس بے رُخی کو بھی قبول کر لیا۔ اس کا عزم پختہ تھا۔

مانگ پے کے جانے کے بعد اُسے گزرے ہوتے پندرہ برسوں کا صرف ایک خوشگوار واقعہ یاد آیا۔ یہ دو ہی مہینے پہلے کا واقعہ تھا۔ وہ جس بحری جہاز میں برما کے لیے انگلینڈ سے روانہ ہُوا تھا اس کی فرسٹ کلاس میں بہت سے مسافر تھے۔ ان میں ایک جواں سال لڑکی کیرولین بھی تھی جس کی رنگت یورپی باشندوں کی طرح سفید نہیں بلکہ سفیدی مائل سانولی تھی۔ رچرڈ اس کے ساتھ بے تکلف ہو گیا۔ وہ شادی کے فوراً بعد بیوہ ہو گئی تھی اور اب ایک مشن کے ساتھ ہندوستان جا رہی تھی۔ دونوں کی بے تکلفی محبت کی حدود کو چھونے لگی۔ رچرڈ نے کیرولین کو تھانگ ڈُو کے متعلق ساری بات کہہ سنائی اور اُسے بتایا کہ وہ اب اپنے گناہ کا کفّارہ ادا کرنے جا رہا ہے۔ اُس نے کیرولین سے کہا کہ وہ اُس کے ساتھ برما چلی چلے اور وہ شادی کر لیں گے۔ کیرولین نے اُسے کہا کہ وہ اس سے ضرور شادی کرے گی لیکن ہندوستان کے مشن سے دستبردار نہیں ہوگی۔

یہ پہلی لڑکی تھی جو رچرڈ کے معیار پر پوری اُتری۔ بمبئی تک کا کئی دن کا سفر رومانوں میں گزر گیا اور بمبئی کی بندرگاہ آ گئی۔ دونوں بوجھل دل سے جُدا ہوئے اور اس وعدے نے دونوں کے دلوں کو سہارا دیا کہ وہ جلدی ملیں گے اور شادی کر لیں گے۔

مگر آج رات جب رچرڈ تھانگ ڈُو کے مہمان خانے میں تنہا لیٹا اس گاؤں کی بہبود اور بہتری کے متعلق سوچ رہا تھا تو اُس نے اس اندھی لڑکی کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔ وہ چارپائی سے اُٹھ بیٹھا اور فیصلہ کر لیا کہ وہ اس اندھی لڑکی کے ساتھ شادی کرے گا۔ اس ارادے نے اُس کے ضمیر سے کانٹا نکال پھینکا اور وہ نہایت اطمینان سے لیٹ گیا۔

صبح کے وقت وہ ہشاش بشاش باہر نکلا۔ وہ گاؤں سے دُور نکل گیا۔ جب واپس آ رہا تھا تو اُسے گاؤں سے باہر اندھی لڑکی آتی نظر آئی۔ رچرڈ نے سوچا کہ

اس سے بات کرنے کا یہ اچھا موقع ہے۔ وہ اس کے قریب پہنچا اور اسے روک لیا۔ اس کے جلے ہوئے چہرے کو دیکھ کر رچرڈ کو اس کا پندرہ برس پہلے کا دلکش چہرہ یاد آگیا جس نے اس کی ذات میں زلزلے بپا کر دیئے تھے۔

"پی ژن!" — رچرڈ نے کہا — "مجھے اجنبی نہ سمجھو۔ میں اب تمہارے گاؤں کا ایک فرد ہوں اور تمہاری مدد کو آیا ہوں۔"

اندھی لڑکی کا جسم تھر تھر کانپا۔ اُس کے منہ سے دلدوز چیخ نکلی اور وہ دریا کی طرف بھاگ اٹھی۔ وہ اندھا دھند دوڑتی گئی اور رچرڈ بےبسی کے عالم میں اپنے جھونپڑے میں آگیا۔

بہت دیر گذر گئی۔ مانگ پے آگیا۔

"آؤ مانگ پے!" — رچرڈ نے اسے کہا — "مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں.... پی ژن کے آنے تک بیٹھو۔ وہ کھانا لے کے آئے گی۔"

"وہ اب نہیں آئے گی" — مانگ پے نے دُکھ زدہ لہجے میں کہا۔

"کیوں؟"

"وہ مرگئی ہے۔"

"مرگئی ہے؟" — رچرڈ نے گھبرا کر پوچھا — "کیسے؟.... اُسے کیا ہُوا؟"

"وہ دریا میں ڈوب مری ہے" — مانگ پے نے کہا — "میں اُدھر سے آرہا تھا اور اُسے بھاگتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ میں بھی اُس کے پیچھے گیا۔ اُس نے سیلابی دریا میں چھلانگ لگا دی اور میرے سامنے ڈوب گئی ہے۔ میں اسے بچا سکتا تھا لیکن نہیں بچایا۔ اذیت سے نجات پانے کا یہی ایک ذریعہ تھا جو اُس نے اختیار کیا۔ میں خوش ہوں۔ آج سارا گاؤں خوش ہوگا۔"

"تم نے اُسے ڈوبنے دیا؟" — رچرڈ نے غصے سے کہا — "تم اُس کے قاتل ہو۔ تم اُسے بچا سکتے تھے۔"

"ایک قاتل کسی دوسرے انسان کو قاتل نہیں کہہ سکتا" — مانگ پے نے قہر آلود آواز میں کہا — "سنو انگریز مسافر! اُس کے قاتل تم ہو۔ اس گاؤں کو تم نے جلایا تھا۔ نمبردار کو تم نے گولی مروائی تھی اور یہاں کے انسانوں کو تم نے زندہ جلایا تھا۔"

رچرڈ پر سکتہ طاری ہوگیا۔ حلق یکبارگی خشک ہوگیا۔

مانگ پے کہہ رہا تھا — "تم جس وقت گاؤں میں داخل ہوئے تھے میں نے اُسی وقت تمہیں پہچان لیا تھا۔ تم نے جھوٹ کہا تھا کہ وہ تمہارا دوست تھا جس نے گاؤں جلایا اور نمبردار کو قتل کرایا تھا۔ میں نے گاؤں کے بچے بچے کو بتا دیا تھا کہ یہ ہے وہ انگریز جس نے پندرہ برس گزرے اس گاؤں کو آگ لگائی تھی اور میرے نمبردار باپ کو گولیوں سے مروایا تھا" — مانگ پے نے غصے اور نفرت سے کہا — "اس اندھی لڑکی نے بھی تمہیں پہچان لیا تھا۔ وہ دیکھ نہیں سکتی تھی لیکن اُس نے تمہاری آواز پہچان لی تھی اور اُس نے تمہاری بُو سونگھ لی تھی۔ تمہاری آواز اور تمہاری بُو نے اس کے سینے کے زخم پھر ہرے کر دیے اور وہ ڈوب مری۔ وہ مجھے سب کچھ بتا کر مری ہے۔ وہ میرے پاس رُکی تھی اور مجھے بتایا تھا کہ وہ خودکشی کرنے جا رہی ہے۔ میں نے اُسے روکا نہیں تھا۔"

رچرڈ کا سر جھک گیا اور اُس نے اپنے گالوں پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو اچھی طرح محسوس کیا۔

مانگ پے نے کہا — "باہر آدمی کھڑے ہیں۔ اپنا سامان اٹھواؤ اور گاؤں سے نکل جاؤ۔ اپنی دولت وہیں لے جاؤ جہاں سے لائے ہو۔"

تھوڑی دیر بعد سات آٹھ برمی دیہاتی رچرڈ کا سامان اٹھائے چلے جا رہے تھے اور رچرڈ ان کے آگے آگے سر جھکائے چلا جا رہا تھا۔ وہ شکست خوردہ تھا۔ بوجھ جو ضمیر سے اُترتا محسوس ہُوا تھا اب اور زیادہ وزنی اور ناگوار ہوگیا تھا۔ دل میں کانٹا اور گہرا اُتر گیا تھا۔

وہ سر جھکائے چلتا چلا گیا۔ اُسے پاپیادہ کوسوں کی مسافت طے کرکے کلیوا کے قصبے میں پہنچنا تھا۔ یہ راستہ گھنے جنگلوں اور گھاٹیوں کی بھول بھلیوں سے گزرتا تھا۔ گھنٹے بھر کی مسافت کے بعد اُسے محسوس ہُوا کہ وہ غلط راہ پر جا رہا ہے لیکن اُسے اطمینان تھا کہ گاؤں کے آدمی اس کا سامان اٹھائے پیچھے پیچھے آرہے ہیں۔ اگر وہ غلط راہ پر چلا تو وہ اسے روک لیں گے۔ وہ رُک گیا۔ گھوم کر پیچھے دیکھا تو وہاں کوئی اور آدمی نہیں تھا۔ وہ اکیلا تھا۔ وہ جنگل سے ڈھکی ہوئی گھاٹیوں اور چٹانوں کی بھول بھلیوں

میں تن تنہا کھڑا تھا۔ اُسے کچھ خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں ہے اور کس سمت سے آیا ہے اور کس سمت کو جانا ہے اور اُس کا سامان اٹھائے جو سات آٹھ آدمی اس کے پیچھے آرہے تھے کب اور کہاں غائب ہو گئے ہیں۔

تب اُسے یاد آیا کہ برما کے برطانوی سفارت خانے کی سیکرٹری نے اُسے خبردار کیا تھا کہ جس علاقے میں تم جا رہے ہو وہ ڈاکوؤں اور رہزنوں سے بھرا پڑا ہے وہ وہیں بیٹھ گیا۔ اُس نے اطمینان کی آہ بھری اور اُس کے رگ و ریشے میں مسرّت کی لہر دوڑنے لگی۔ اس نے سوچا کہ اُس کی دولت لُٹ گئی ہے، لیکن گئی تھانگ دُو میں ہے۔ وہ تھانگ دُو کے لیے ہی یہ دولت لایا تھا۔ اب وہ لوگ اچھے جھونپڑے بنالیں گے۔ جنگ کی تباہ کاریوں نے انہیں ڈاکو بنایا ہے۔

وہ وہیں لیٹ گیا۔ اُسے اب کوئی غم نہ تھا کہ وہ بھٹکا ہُوا مسافر ہے۔ اس نے اپنے آپ سے کہا کہ گناہ کا کفّارہ ادا ہو گیا۔ اب تھانگ دُو بھی نہیں جاؤ گا اور انگلینڈ بھی نہیں جاؤں گا۔

پندرہ برس بعد اس نے پہلی بار روحانی کیف محسوس کیا اور وہ برما کے گھنے جنگل میں لیٹ گیا جہاں شام کے بعد چیتوں، بھیڑیوں اور ہر طرح کے درندوں کی حکمرانی ہوتی ہے۔

